نگار

قیمت فی کاپی ۸ر

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے وادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالا اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصہ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پیش ہوئے ہیں، اس اڈیشن میں پچھلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز (حصہ دوم)

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب نقادی حیثیت رکھتے ہیں وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہو انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اسکی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

ترغیبات جنسی (یا)
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ بحث و تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

مجموعۂ استفسار و جواب

ان تینوں جلدوں میں [illegible] نگار کے استفسار و جواب [illegible] گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت [illegible] بیکار ہے کیونکہ نگار کی [illegible] اس باب میں حاصل ہوا [illegible] تمہیں ان تینوں جلدوں [illegible] تاریخی و تنقیدی مسایل [illegible] اسکی حیثیت ایک [illegible]

اردو انعامی معمّے (رجسٹرڈ) دہلی

اردو کا سب سے پہلا معیاری معمّہ

دوسرا انعام ۷۲۲

تیسرا انعام ۵۰۰

کل ۲۲۲۲ روپیہ

دو ہزار دو سو بائیس روپے کے انعامات

اشارے سیدھے

(۱) صرف تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ہمارے معمے اس لئے آسان ہیں (۲) ایک ہجائی (۳) تیز کی زیادتی کا اندازہ چہرے سے بھی لگایا جا سکتا ہے (۴) شادی کے موقعوں پر آزاد خیال لوگ بھی ریا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں (۵) بادشاہوں میں بھی ایسے ہوتے ہیں جو دل کی خاطر اس کی پروا نہیں کرتے (۶) ملکی ترقیاں تیزی کے ساتھ وہیں ہو سکتی ہیں جہاں لوگ دور اندیش بھی ہوں (۷) تعلیم یافتہ بیوی کی زندگی اور بھی تلخ ہو جاتی ہے اگر جاہل شوہر بات میں اپنے اس کو کام میں لانے لگے۔ (۱۴) کتنا عمر تناک ہونا چاہئے وہ منظر جب کوئی انسان آپ کی آنکھوں کے سامنے حالت نزع میں پڑا ہو۔ (۱۴) مناسب خواتین بعض اوقات ذرا ذرا سی بات پر اس سے دوچار ہو جاتی ہیں۔

نقص و خلہ

کوپن مفت دیئے جاتے ہیں لیکن ہر دو کوپن کے ساتھ تیسرا [illegible] یا بھیجنا لازمی ہے۔ کوپن جو [illegible] آنے [illegible] جلد بھیجنے والوں کو ایک ایک کوپن زائد دیا جائے گا۔ [illegible] کوپن ہوں ساتھ کوپن پر [illegible] کے بھیجے جائیں۔ تمام حل موصولہ [illegible] کے ذریعہ [illegible] دہلی آنے چاہئیں۔ معمولی خط کے ضائع ہونے کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی۔ البتہ رجسٹری شدہ بھیجنے پر حل کی رسید آپ کو ملے گی۔ [illegible] پشت پر صرف تعداد حل ملفوفہ اور اپنا نام پتہ لکھئے۔

اشارے کھڑے

(۱) طویل خاموشی کے بعد اگر محبوب محبت کرنے والے کو اس کی صرف ایک مخصوص پرانی یاد بھیجدے تو محبوب کے ارادوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے (۲) بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کا یہ ساری عمر ساتھ دے۔ (۳) ایسا آدمی اگر خود بھی ہو تو تمام خاندان کے لئے مصیبت سے کم نہیں۔ (۴) ذرا سی بے وفائی اس کے طلسم کو توڑ دیتی ہے (۵) اگر عورت کے دل میں مرد کا سچا پیار موجود ہو تو وہ بڑی سے بڑی قربانی کر سکتی ہے (۹) بیویوں کے ساتھ ساتھ داشتہ پر داری بھی بالعموم پائی جاتی ہے (۱۰) مغربی ممالک کی عورتیں ہندوستانی عورتوں کے مقابلے میں یہ جلد ترک کر سکتی ہیں۔

آخری تاریخ

میں کی آخری ڈاک سے تمام وہ حل موصول ہو جانے چاہئیں جو نمبر [illegible] تک تمام داخلے وصول شدہ سمجھے جائیں گے جو اس تاریخ تک موصول کرانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر رسید مل جانے کے بعد موصول

تاریخ اشاعت

جو حل موصول [illegible] ہوں گے [illegible] کے ساتھ بھیجے جائیں گے۔

میں نے قواعد و شرائط کو بغور پڑھ لیا ہے اور اس معمے میں شرکت کرتے ہوئے مجھے اقرار ہے کہ منجر معمہ ہذا کا فیصلہ میرے حق میں قطعی اور قانوناً قابل تسلیم ہوگا۔

نام و پتہ (دستخط) سید صادق امام معرفت السید رضا صاحب

[illegible] سبزی منڈی الہ آباد

کل تعداد ملفوفہ (۱)

نمبر رسید منی آرڈر یا کاسٹ پوسٹل آرڈر ملفوفہ

نام اخبار یا رسالہ جس سے معمہ حاصل کیا۔ نگار

دستخط S.S.

اردو انعامی معمے (رجسٹرڈ) نمبر ۲ جامع مسجد دہلی

اشارے سیدھے ←

اشارے کھڑے ↓

ت	ف	ر	ی	ح	د ۲	س
ح				خ ۴	و	ن
ر		ر ۴	س	م	س	
ی		ج ۵	ا	ن	ت	
ر				ر ۶		پ
	ا	ش		ک ۱۰	ا	م ۹ ی
ف ۳	ہ	م		ز	ک	ا
چ ۳	ل		ع ۱۲	م	ر	ر

میں نے قواعد و شرائط کو بغور پڑھ لیا ہے اور اس معمے میں شرکت کرتے ہوئے مجھے اقرار ہے کہ منجر معمہ ہذا کا فیصلہ میرے حق میں قطعی اور قانوناً قابل تسلیم ہوگا۔

نام و پتہ (دستخط) سید صادق امام معرفت السید رضا صاحب

[illegible] سبزی منڈی الہ آباد

کل تعداد ملفوفہ (۱)

نمبر رسید منی آرڈر یا کاسٹ پوسٹل آرڈر ملفوفہ

نام اخبار یا رسالہ جس سے معمہ حاصل کیا۔ نگار

دستخط S.S.

قواعد و ضوابط

(۱) کوپن کی خانہ پری صرف روشنائی سے ہونی چاہئے (۲) اشاروں کا جواب نکالتے وقت ہمارا لحاظ رکھئے کہ ہم نے زبان ہندوستانی معمولی استعمال کیا ہے لیکن اس پر لفظ کے معنی کو ترجیح نہیں کیا ہے (۳) [illegible] تمام استعمال کئے گئے ہیں ہمیشہ معنی کی صحت دیکھئے جائے گی [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible] (۷) [illegible] (۸) [illegible] (۹) [illegible] (۱۰) [illegible] (۱۱) [illegible] (۱۲) [illegible] (۱۳) [illegible] (۱۴) [illegible] (۱۵) [illegible] (۱۶) [illegible] (۱۷) [illegible] (۱۸) [illegible] (۱۹) [illegible] (۲۰) [illegible] (۲۱) [illegible] (۲۲) [illegible] (۲۳) [illegible] (۲۴) [illegible] (۲۵) [illegible] (۲۶) [illegible] (۲۷) [illegible] (۲۸) [illegible] (۲۹) [illegible] (۳۰) [illegible]

منجر اردو انعامی معمے (رجسٹرڈ) جامع مسجد دہلی

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کرکے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ۔ مشکی قوام۔ الائچی دانہ۔ تیل۔ عطر۔ عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف
قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبّی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا
مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ

ٹیلی فون :- ہوڑہ، ۴۵۵

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

دی مغل لائن لمیٹیڈ

حج

عازمینِ حج کے لئے ہدایات

عازمینِ حج کی توجہ حکومتِ ہند کے اُن مختلف اعلانات کی طرف مبذول کی جاتی ہے جو ۱۵ مئی یا اس کے بعد انگریزی اور اُردو کے بڑے بڑے اخباروں میں شایع ہو چکے ہیں۔

جہاز کا کرایہ (مع خوراک)

بمبئی سے جدّہ واپسی	کراچی سے جدّہ واپسی
فرسٹ کلاس -/-/۹۷۵	فرسٹ کلاس -/-/۹۵۰
عرشہ جہاز -/-/۲۸۵	عرشہ جہاز -/-/۲۷۵

ان کرایوں میں کامران کا قرنطینہ، جدّہ کے طبّی اخراجات اور کشتی کا کرایہ شامل نہیں ہے جو مجموعی طور پر ۶۹ روپے ۱۰ آنے ۹ پائی ہے۔ بمبئی اور کراچی سے ۷ ستمبر اور ۱۸ اکتوبر کے درمیان جہاز روانہ ہوں گے۔ صحیح تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

عازمین حج تفصیلات ذیل کے پتہ سے طلب کریں:- حج بکنگ آفیسر۔ کونسل چیمبر۔ گورنمنٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی
ٹرنر مارلین اینڈ کمپنی لمیٹیڈ۔ ۱۶ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

صافی

تن دُرست رکھتی ہے، خُون صاف کرتی ہے،
میں ہمیشہ خست رستی ہوں

موجودہ ادب سے انتخاب

نظم

بانگ درا ... مجلد ... اقبال ... للعہ ۸/

بال جبریل ... " ... " ... للعہ ۸/

ضرب کلیم ... " ... " ... ۸/ے

زبور عجم ... " ... " ... للعہ ۸/

ارمغان حجاز ... " ... " ... للعہ ۸/

پس چہ باید معہ مسافر ... " ... ۸/ عا

پیام شباب ... قاضی نذرالاسلام ۸/ عہ

شعلہ و شبنم ... جوش ملیح آبادی ۸/ صہ

عرش و فرش ... " ... " ... للعہ ۸/

حسین اور انقلاب " ... عہ ۸/

شعرستان ... اختر شیرانی ... عہ ۸/

دھڑکنیں ... احمد ندیم ... ۸/ عہ

الطاف کے گیت ... الطاف مشہدی ۸/ عہ

گلبانگ حیات ... امین حزیں ... ۸/ے

کفر و ایمان ... بہزاد لکھنوی ... ۸/ عہ

گیت مالا ... صلاح الدین میراجی ... ۸/

تعلقہ ... حاجی لقلق عہ ۱۲/ ۸/ منقار لقلق عہ ۸/

رنگ بست ... اثر لکھنوی ... ۸/ عہ

نقش چغتائی ... چغتائی ... عہ ۸/

مرقع چغتائی ... " ... معہ ۱۲/ ۸/

نثر

رحمت اللعالمین، مکمل تین جلد ... قاضی سلیمان ... معہ ۱۲/ ۸/

مقالات جمال الدین افغانی مترجم سید ایم ... ڈی ... ایم اے ... عا ۸/

راہگذر ... عاشق بٹالوی (افسانے) ... عا ۸/

پطرس کے مضامین ... پطرس (مزاحیہ) ... عا ۸/

مضامین فلک پیما ... (مزاحیہ) ... ۸/ے

کیلے کا چھلکا ... سندباد جہازی (مزاحیہ) ... عا ۸/

گنجہائے گرانمایہ ... رشید احمد صدیقی ... عا ۸/

گفت و شنید ... بشیر ہاشمی ... عا ۸/ ❊ گرد و پیش (افسانے) ... ۸/ے

خوفناک دنیا ... سید محمد علی شاہ (اول، دوم) ... ۱۲/ ۸/ے

اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ... ڈاکٹر عبداللہ ... ۱۲/

خار و گل ... ایم اسلم للعہ ۸/ ❊ مزاحیہ ڈرامہ ... خلیل ... عا ۸/

ٹیپو سلطان ... امجد علی عہ ۸/ ❊ جرم و سزا ... باری علیگ ... عہ ۸/

جاہ و جلال ... تبسم عہ ۸/ ❊ دروازہ ... کرشن چند ... عا ۸/

شب غم ... ایم اسلم عا ۸/ ❊ کروٹ ... منٹو عا ۸/ ❊ منٹو کے مضامین عا ۸/

لیلیٰ کے خطوط ... قاضی عبدالغفار ... عا ۸/

اس نے کہا ... " ... عہ ۸/

مجنوں کی ڈائری ... " ... عا ۸/

افسانہ زریں ... اسماء طیب حسین عہ ۸/ ❊ جواب ... کرنل مجید ملک عہ ۸/

شمع ... اے آر خاتون (ناول) ... صہ ۸/

تصویر ... " ... " ... للعہ ۸/

تاریخ اسلام سید امیر علی شاہ کا مکمل تین جلدوں میں بامحاورہ اور سلیس ترجمہ از باری علیگ فی حصہ عہ ۸/ مجلد مکمل ہر سہ حصہ ۸/ے

نوٹ: مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اردو اکاڈیمی لاہور

"ماجد ولین"

ایک مغنی کی دردناک داستان، جسکو محبت کی ناکامیوں اور غمِ محرومی نے، دنیائے موسیقی میں غیر فانی بنا دیا۔
ایک آرٹسٹ کا حقیقی افسانۂ درد و الم جسنے عورت کو آرٹ سمجھکر محبت کی اور آخر کار اس کے لئے جان دیدی۔
ایک "خیال پرست" انسان کے داعیاتِ عشق کی دلدوز کہانی جسکے دل میں محبت ایک چنگاری کی طرح پیدا ہوئی اور آخر آخر التہاب جہنم بن کر اس کو خاکستر بنا گئی۔

یہی داستان آیندہ جنوری کے "نگار" میں آپ کی نگاہ سے گزرے گی اور بہت سے وہ آنسو جو اب تک آپ کے دل کی گہرائیوں میں محفوظ ہیں، آپ سے طلب کرے گی۔ منیجر نگار

نگار

سالانہ چندہ پانچ روپیہ پیشگی

مدیر خصوصی:- نیاز فتحپوری

جلد- ۵۰ | فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء | شمار - ۴

ملاحظات ---------- ۶

مودودی اسکول کے تربیت یافتہ نقاد- (پروفیسر) شوکت سبزواری ۹

چوڑیاں ---------- اقبال متین ---- ۲۰

قدیم سنسکرت لٹریچر ---- ا- ح ---- ۲۶

ماجدولین کا ایک صفحہ ---------- ۳۴

شور (علیگ) ---------- حامد عزیز مدنی ... ۳۶

باب المراسلۃ والمناظرہ -- فراق گورکھپوری -- ۴۳

مالہ وماعلیہ -- غلام ربانی عزیز ام-اے --- ۴۷

نظم تعزیت ---------- جمیل مظہری ---------- ۵۶

شام اپالو (نظم) شمیم نعمانی - کلام اسعد شاہجہانپوری ۵۸

شیفتہ --- (بیاض نیاز) ---------- ۵۹

مطبوعات موصولہ ---------- ۶۰

ملاحظات

عرضِ حال جنوری سے اس وقت تک مینے جس عالم میں زندگی بسر کی ہے، اس کی صراحت بیکار ہے، کیونکہ اس سے نہ میرے درد کا علاج ممکن ہے اور نہ آپ کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں اپنی مسرتوں میں تو ساری دنیا کو شریک ہونے کی دعوت دے سکتا ہوں، لیکن غم والم میں کسی اور کی شرکت مجھے گوارا نہیں۔ اس لئے میں اپنے درد کی داستان تو آپ کو سنانا نہیں چاہتا، (اور سنانا چاہوں بھی تو وہ الفاظ کہاں سے لاؤں، جو میرے تاثرات کی صحیح ترجمانی کر سکیں) لیکن چونکہ اس دوران میں، دل و دماغ کے تعطل کی وجہ سے نگار کی ترتیب پر میں پوری توجہ صرف نہیں کر سکا اس لئے بسبیل معذرت اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

ٹھیک اسی زمانہ میں جبکہ ستمبر کا نگار لکھا جا رہا تھا، ۲۰ر اگست کو وہ حادثہ پیش آیا جس کا اجمالی ذکر میں پچھلی اشاعت میں کر چکا ہوں اور میں بالکل بے خبر رہا کہ کون مضمون کس وقت کاتب کو دیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مقالہ

ایسا بھی شایع ہوگیا جس کے بعض فقرے یقیناً ناقابل اشاعت تھے اور اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب ستمبر کا نگار پوسٹ ہو چکا تھا۔ اس کا مجھے جتنا افسوس ہے، اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا، کیونکہ نگار کی پچھلی ایک ربع صدی کی زندگی میں، یہ اپنی قسم کا بالکل پہلا واقعہ ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ اظہار ندامت و تاسف کے بعد بھی میں اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتا ہوں۔

یونتو دنیا میں انسان کے تجربات آخری سانس تک ختم نہیں ہوتے اور یہ کوئی حیرت کی بات بھی نہیں، لیکن علمی و ادبی دنیا کے بعض تجربات یقیناً حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

عالم ہو یا ادیب، شاعر ہو یا خطیب۔ تہذیب و اخلاق، متانت و سنجیدگی کی سب سے زیادہ توقع ہمیں انھیں سے ہو سکتی ہے، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جب امتحان کا وقت آتا ہے تو یہی سب سے زیادہ غیر مہذب، اور بد اخلاق ثابت ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انسان فطرتاً بڑا برخود غلط واقع ہوا ہے اور اپنے مزعومات کے خلاف کوئی بات سننا اسے مشکل ہی سے گوارا ہوتی ہے، لیکن ایک پڑھا لکھا انسان بھی اس ناگواری کو نہ چھپا سکے تو اس کا شمار بھی معمولی انسانوں ہی میں ہوگا اور افسوس ہے کہ اس لحاظ سے ہمارے اکثر شعراء و ادیب، علماء و فضلاء اسی قسم کے معمولی انسان ہیں، کیونکہ جب انکے مزعومات کے خلاف کوئی بات کہی جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں یا سنجیدگی سے اسکا جواب دیں، جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر سوقیانہ حرکات پر اتر آتے ہیں۔ علم کے ساتھ سلیقہ دیکھئے ہم لوگوں میں کب پیدا ہوتا ہے!

دو مہینے کے بعد نگار کا پچیسواں سال ختم ہو جائے گا اور اصولاً ہم کو حق پہونچتا ہے کہ نئے سال کے آغاز میں، ہم نہ صرف اپنی خدمات کا احتساب کریں، بلکہ اس پر بھی غور کریں کہ ایک چوتھائی صدی کی مدت میں، ادبی دنیا کن انقلابات سے دوچار ہوئی اور آیندہ ہمیں کونسی راہ اختیار کرنا ہے۔

ادبیات میں سب سے زیادہ نمایاں انقلاب وہ ہے جسے "ادب جدید" یا "ترقی پسند ادب" کہتے ہیں، لیکن کسقدر حیرت کی بات ہے کہ یہ تحریک، شعر و شاعری اور فسانہ نگاری کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی اور کوئی علمی شان اس میں پیدا نہ ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری شاعری کو بہت سے نئے اسلوب بیان حاصل ہوئے اور فسانہ نگاری میں بھی رومان کی پگڈنڈی سے ہٹ کر زندگی کے مشاہدات کو پیش کیا گیا، اور یہ دونوں باتیں بجائے خود قابل تعریف ہیں، لیکن اس سیلاب میں کچھ ثابت قدم رہے اور کتنوں کے پاؤں ڈگمگا گئے، اس کو نظر انداز کر کے ہم کسی صحیح راہ کی تعیین نہیں کر سکتے۔

دنیا اور اس کے داعیات کے ساتھ چلے بغیر کسی قوم کا لٹریچر ترقی نہیں کر سکتا، لیکن یہ سوال بھی کم قابل غور نہیں کہ زمانہ کا ہر اقتضاء اس قابل ہے کہ اس کے سامنے سر جھکا دیا جائے اور کیا زمانہ کی رو کے ساتھ بہ جانا ہی کمال انسانیت ہے؟

اور ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ادیبوں اور شاعروں نے اس سوال پر غور نہیں کیا۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ لٹریچر کا اولین فرض قومیت کی تعمیر ہے، لیکن قومیت نام تقلید و استعارہ کا نہیں بلکہ اُن ذہنی اقدار کی اُستواری کا ہے، جو خود اپنے قومی کلچر اور روایات کے زیر اثر متعین ہوتے ہیں، اس لئے اگر ہم اپنے ادب کو محض دوسروں کی تقلید کی بنا پر ترقی یافتہ کہتے ہیں، تو یہ ترقی نہ ہمارے لئے مفید ہو سکتی ہے نہ قابل فخر، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ترقی پسند شاعر اور فسانہ نگار اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

خیال و عمل کی آزادی اس میں شک نہیں عمدہ چیز ہے اور جب تک یہ ذوق کسی قوم میں پیدا نہ ہو، وہ صحیح معنی میں ترقی نہیں کر سکتی، لیکن آزادی کے اُصول متعین کرنا آسان نہیں اور ان پر کاربند ہونا تو کہیں زیادہ مشکل ہے۔ جدید تعلیم نے نئی نسل کو یقیناً آزادی کی طرف مایل کیا ہے، لیکن یہ آزادی روح کی نہیں، بلکہ جسم کی ہے، اور اسی لئے ان کی آزادی محض "مطلق العنانی" ہے اور اخلاق کی "عنانگیری" سے بالکل آزاد۔

انھوں نے آزادی کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ جو منہ میں آئے وہ بلا پس و پیش کہہ ڈالا جائے اور تہذیب و انسانیت کے اُصول کو تقویم پارینہ سمجھ کر اس کا مضحکہ اُڑایا جائے حالانکہ آزادی کی پہلی شرط ضبط نفس ہے اور یہی ہمارے موجودہ ادیبوں اور شاعروں میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

شاعری کو آپ ردیف و قافیہ سے آزاد کر سکتے ہیں، قدیم اسالیب بیان ترک کر کے آپ اظہار خیال کے نئے نئے زاویے پیدا کر سکتے ہیں، لیکن آپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ ہماری تہذیب و ثقافت اور قومی اخلاق کی توہین کیجئے۔ مغرب داہل مغرب میں اچھی باتیں بھی ہیں اور بُری بھی، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ آپ بُری باتیں تو اختیار کر لیتے اور جو اچھی ہیں انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔

علاوہ اس کے اگر آپ ادب کو زندگی سے علٰحدہ نہیں کر سکتے اور آپ کا مقصود ادب سے زندگی کو سنوارنا ہے تو پھر آپ وہ ذرایع کیوں نہیں اختیار کرتے جو شعر و شاعری اور فسانہ نگاری سے زیادہ مفید و ضروری ہیں۔ تاریخ کی کتابیں لکھئے، سیاسیات کا درس دیجئے، اقتصادیات کے مسایل سمجھائیے، علوم جدیدہ سے باخبر کیجئے اور سب سے زیادہ یہ کہ عام تعلیم کی طرف ملک کو متوجہ فرمایئے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس طرف نہ ہمارے ادبا، و شعرا کو توجہ ہے نہ رسایل و اخبارات کو، اور اس پر دعوٰے ہے "ادب برائے زندگی" کے علمبردار ہونے کا ——!

یہی تھے وہ خیالات جن کی بنا پر ہمارا ارادہ تھا کہ پچھلے ۲۵ سال کے ادبیات پر تبصرہ کر کے آیندہ کے لئے کوئی مناسب راہ اختیار کریں، لیکن بعد کو یہ سوچا گیا کہ کہنے سے بہتر یہ ہے کہ اسے کر کے دکھایا جائے اور اگر زندگی نے مساعدت کی، تو ۱۹۴۷ء میں ہم اپنے لائحۂ عمل کو بروئے کار لانے کی پوری کوشش کریں گے، جس کا تعلق نہ صرف نگار سے ہوگا، بلکہ اس دارالاشاعت سے بھی جو بہت بڑے وسیع پیمانہ پر نہایت بلند ارادوں کے ساتھ قایم کیا جانے والا ہے۔

مودودی اسکول کے تربیت یافتہ نقاد

پچھلے دنوں میں نے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں مسئلہ امارت کی اسلامی حیثیت اور اس کی خالص مذہبی اہمیت پر بحث کی گئی تھی۔ اس مضمون لکھنے کا بڑا محرک یہ تھا کہ میرے ایک عزیز دوست، جنھیں میں مخلص اور نیک نیت بھی سمجھتا ہوں، مولانا مودودی کے ارادتمندوں میں شامل ہیں۔ وہ جب کبھی میرے پاس آتے مولانا مودودی اور ان کی اسلامی تحریک کا ضرور ذکر فرماتے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں بھی ان کی جماعت میں شامل ہو جاؤں۔ اس غرض کے لئے گاہے گاہے مولانا مودودی کے بعض سیاسی رسالے بھی انھوں نے مجھے مطالعہ کی غرض سے دئے۔ ہر چند مولانا مودودی کی بیشتر اہم تصنیفات اور ان کی وہ تحریریں، جو ان کے مشن اور تبلیغی کام کی وضاحت کے سلسلہ میں شایع ہوئی ہیں، میری نظر سے گزر چکی تھیں اور میں ان میں کوئی اچھوتا، تازگی اور ندرت نہ پاتا تھا۔ مگر عزیز مذکور کی خاطر وہ رسائل بھی لے لیا کرتا جو وہ نیک نیتی کے ساتھ مجھے "جیتنے" کے خیال سے دیا کرتے تھے اور یہی نہیں بلکہ اپنے وقت کا ایک حصہ نکال کر پڑھا بھی کرتا تھا۔ مجھے ان تحریروں میں کبھی کوئی جان نظر نہ آئی۔ بے جان الفاظ کا ایک انبار تھا یا محض خطابت کی وہ خصوصیات جو ایک تحریر کو حقیقت اور حکیمانہ بالغ نظری سے بہت دور پھینک دیتی ہیں۔

اس سلسلے میں انھوں نے اجتماعات جماعت اسلامی کی روداد یں بھی دکھائیں۔ غالباً ان کے حصہ اول میں یہ بھی مذکور تھا کہ انتخاب امیر سے متعلق تین تجویزیں جماعت کے سامنے آئیں۔ اول یہ کہ امیر کا سرے سے انتخاب ہی نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عارضی طور پر کچھ مدت کے لئے کسی کو امیر چن لیا جائے۔ ان دونوں تجویزوں کو جماعت اسلامی کے منتخب علماء نے یہ کہکر ٹھکرا دیا کہ یہ غیر اسلامی اور قطعی جاہلانہ تجویزیں ہیں۔ مجھے یہ بات کھٹکی اور کھٹکنا چاہئے تھی ——— یہ تو میں کیسے کہوں کہ میں نے مدتوں ہر طرح کے تعصبات اور جانبداریوں سے الگ ہو کر اسلام اور قرآن کا خاموش مطالعہ کیا ہے۔ اور اگر نہ کہوں تو بات کیسے صاف ہو۔ اس حقیقت کا اظہار خدا جانتا ہے، میں کسی نفسانی تحریک سے نہیں کر رہا ہوں۔ یہ بھی ایک طرح کی "تحدیث نعمت" ہے۔ بہر حال میں نے خاص طور پر تجویز اول کی نشاں دہی عزیز موصوف کو کرائی اور مختصر طور پر ان کو بتایا کہ آپ کی اسلامی جماعت نے جس چیز کو غیر اسلامی بتا کر مسترد کر دیا ہے وہ اسلامی اسپرٹ کے عین مطابق ہے۔ اور پھر عزیز موصوف ہی کے

کہنے سے میں نے اس تقریر کو قلمبند بھی کرلیا۔ ان کا اصرار تھا کہ میں یہ تحریر "ترجمان القرآن" کو بھیجوں۔ میں جانتا تھا (اس لئے نہیں کہ میں منجم ہوں جیسا کہ رام نگر کے ایک صاحب خیال فرماتے ہیں، بلکہ اس لئے کہ میں خدا کے فضل سے مسلمان ہوں اور ہر مسلمان ایک خاص قسم کی فراست اور بصیرت کا مالک ہوا کرتا ہے) کہ "ترجمان" اس کو شایع نہ کرے گا۔ مگر اتمام حجت کے لئے میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا۔ باقی تفصیلات میں اپنے پچھلے مضمون کے آغاز میں دے چکا ہوں۔ قارئین نے اسے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

میرے اس مضمون پر، جو ماہ مئی کے رسالہ "نگار" میں شایع ہوا ہے، اب تک تین اصحاب نے خامہ فرسائی کی ہے۔ جن میں سے تیسرے صاحب کا جواب ابھی ناتمام ہے۔ اگرچہ دوسرے دو مضامین بھی ناتمام ہی ہیں۔ ایک صاحب نے میرا محض تعارف کرایا ہے اور اپنی کوتاہ قلمی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان کے پاس "مزید وقت" نہیں۔ دوسرے صاحب نے ایک اور مفصل مضمون کی طرف اشارہ ہے جو غالباً یہی ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں میرا خیال تھا کہ ان صاحب کا پورا جواب سامنے آجانے کے بعد کچھ لکھوں گا۔ مگر ایک تو اس وجہ سے کہ جواب، جو "کوثر" میں شایع ہو رہا ہے، مدیر کوثر کی تصریح کے مطابق "ذرا طویل" ہے اور دو قسطوں کے بعد پرچہ کی اشاعت ہی کو نامعین مدت کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے بھی کہ "قیاس کن زگلستان من بہار مرا" جواب کا عام رجحان بتا رہا ہے کہ مجیب نرے ناقل ہیں۔ "حاطب لیل" کی طرح رطب و یابس سب کچھ انھوں نے ادھر اُدھر سے جمع کر لیا ہے۔ دراصل اس نوع کے "طفل دبستاں" میرے مخاطب نہیں اور نہ میں ان کے اطمینان خاطر کا سامان کر سکتا ہوں اس لئے اپنے ناقدوں سے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں ابھی کہے دیتا ہوں۔

مسئلہ امارت ظاہر ہے کہ ایک نہایت ہی نازک اور اہم مسئلہ ہے۔ اسلام نے جس کی بابت مولانا مودودی بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ زندگی کا ایک جامع اور مکمل نظام ہے، اس مسئلہ پر نئی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا مودودی اور ان کے رفقاء اس مسئلہ پر جس طرح اظہار خیال کر رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور اس کے شارح یعنی رسول اکرم نے اس کے متعلق کچھ کہا ہی نہیں۔ اس کی تمام تفصیلات حضرات صحابہ کرام کے عمل و نظر سے مستفاد ہیں۔ اس مسئلہ کی تشریح آیات قرآنی کی روشنی میں جس طرح میں نے پیش کی ہے اگر وہ صحیح ہے تو اس سے قطع نظر کہ ہر صحیح اور سچی بات کے سامنے جھک جانا چاہئے اس میں ایک عام منفعت بھی ہے اور وہ یہ کہ مولانا مودودی، جیسا کہ ان کے ارادت مند ظاہر کر رہے ہیں، ایک جماعت کے امیر بن کر اسلامی اصول و تعلیمات کی جو تبلیغ فرما رہے ہیں، اگر وہ ایک عام اہلِ نظر کی حیثیت سے یہی باتیں کہیں تو شاید زیادہ موثر ہوں۔ اسلامی اصول و تعلیمات کی تبلیغ ہر شخص کر سکتا ہے ایک روایت ہے:- "بلغوا عنی ولو کان آیۃ" (میری طرف سے جو بات بھی تمھیں معلوم ہو دوسروں تک پہونچا دو) حضرت اکرم نے اپنے سب سے آخری وعظ میں ارشاد فرمایا تھا "فلیبلغ الحاضر الغائب فرب مبلغ اوعی

من السامع" (جو موجود ہیں وہ ان تک پہونچا دیں جو موجود نہیں - اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ سننے والے سے وہ شخص بہتر سمجھ اور حافظہ رکھتا ہے جس کو سنایا گیا ہے) ایک اور روایت ہے "کلکم راعٍ و کلکم مسئول عن رعیتہ" (اے مسلمانو! تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور قیامت کے روز اس سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا)

مولانا مودودی بہرحال انسان ہیں - وہ اپنے متعلق شاید یہ کبھی نہ کہیں گے کہ علم و عمل دونوں میں وہ سب سے ممتاز ہیں - غلطیوں سے معصوم اور کوتاہیوں سے محفوظ ہیں - یہ بات اسلامی تعلیمات کی رو سے صرف ایک نبی کو حاصل ہے - اس لئے ان کے امیر منتخب ہو جانے کی صورت میں ان کی کوتاہیاں، ان کی کمزوریاں، ان کی علمی نارسائیاں تبلیغ و ہدایت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں بلکہ یوں کہئے کہ بنی ہیں - مولانا منظور احمد نعمانی مدیر "الفرقان" آپ جانتے ہیں کہ اسلامی جماعت کے کیسے سرگرم کارکن تھے - میں ذاتی طور پر ان سے واقف ہوں - ان کی ذہانت، لیاقت، اور خلوص کا معترف ہوں - مگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولانا مودودی کی ذات سے متعلق بعض امور کی بنا پر وہ جماعت سے الگ ہوئے اور ان کے ساتھ دو چار اور عالموں نے بھی جماعت کو چھوڑا جو شاید بعض بڑے بڑے علاقوں کے امیر بھی بنا دئے گئے تھے - یہ مولانا مودودی کی امارت و ریاست کی وجہ سے ہوا - اور مولانا کی کیا خصوصیت ہے اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا - اس لئے کہ کسی فرد واحد میں نبی کو چھوڑ کر، وہ صفات جمع ہی نہیں ہو سکتیں جو اس میں اس بارگراں کی کفایت پیدا کر سکیں - ضرورت اس بات کی ہے، اور یہی اسلام و قرآن کی تعلیمات کا حاصل بھی ہے، کہ مل جل کر اس بار کو اٹھایا جائے - اور جہاں کوئی دشوار منزل پیش آئے باہمی مشوروں سے اس کو حل کیا جائے - خدائے تعالیٰ ایسی ہی دشوار منزلوں میں اپنے نیک بندوں کی نصر و اعانت فرماتا ہے - "انا لنصر رسلنا والذین آمنوا فی الحیوٰۃ الدنیا" (ہم اپنے انبیاء کی اور عام مومنین کی دنیا کی اسی زندگی میں اعانت فرماتے ہیں) لیکن رسول کی اعانت الہام، وحی یا القاء و وحی سے کیجاتی ہے جس کو قرآن میں "روحِ امر" کہا گیا ہے - "کذالک اوحینا الیک روحا من امرنا (اے نبی! ہم نے اپنے امر کی ایک روح آپ پر نازل فرمائی) مگر عام مومنین کے باب میں ایسا نہیں ہوتا - ان کے لئے شوریٰ (جسکے اصلی معنی ہیں شہد نکالنا) وحی اور القاء کا قایم مقام اور اس کا بہترین بدل قرار دیدیا گیا ہے اور جائے حیرت ہے کہ قرآن حکیم میں شوریٰ کو بھی امر ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے "وامرہم شوریٰ بینہم" عام مسلمانوں پر جو امر الٰہی نازل ہوتا ہے وہ القاء روحی یا الہام ربانی نہیں ہوتا بلکہ وہ سب اہل شوریٰ کے مل جل کر بیٹھنے کے بعد باہمی بحث و نظر سے طے پاتا ہے - یوں کہئے کہ ان پر روح امر نازل نہیں ہوتی بلکہ باہمی مشورہ سے وہ اس "روح" کو خود امر الٰہی (قرآن و سنت رسول) سے اس طرح نکالتے ہیں جیسے موم سے شہد نکالا جاتا ہے -

تنقید کرنے والوں کے پیش نظر یہ بھی رہنا چاہئے کہ خود مولانا مودودی نے اپنے ایک رسالہ میں جس کا عنوان ہے "اسلام کا نظریۂ سیاسی" لکھا ہے کہ ہر مسلمان اپنی جگہ خلیفہ ہے۔ اور شاید ثبوت میں یہ آیت بھی پیش کی ہے "وعداللہ الذین آمنوا الخ" خدا نے مومنوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان سب کو زمین میں خلیفہ بنائے گا) اور اس کو اسلامی نظریۂ سیاست کی ایک اہم خصوصیت بتایا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ہر مسلمان اپنی جگہ خلیفہ ہے۔ یا یوں کہئے کہ اپنا حاکم آپ ہی ہے۔ کوئی دوسرا اس کا حاکم، امیر، یا خلیفہ نہیں، تو پھر کس اُصول کے مطابق، کون سی نص کی رو سے، کس فرمان نبوی کو سامنے رکھ کر اس کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ اس خلافت کو کسی دوسرے کی طرف منتقل کردے؟ اور اس طرح اپنی آزادی کو چھوڑ کر، جو خدا کا ایک بہت بڑا عطیہ ہے، سابق کی طرح پھر اپنے جیسے انسان کی اطاعت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے۔ اسلام نے نبی کے بعد کسی ایک فرد کی عصمت کا وعدہ نہیں کیا۔ ہر شخص بڑی سے بڑی غلطی اور خطا کا مرتکب ہو سکتا ہے اور ٹھوکر بھی کھا سکتا ہے۔ البتہ جماعت کی بابت حضرت اکرم نے یہ ضرور ارشاد فرمایا ہے: "یداللہ علی الجماعۃ" (جماعت پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے)

میرا مطالبہ یہ ہے کہ اس "تحویل وسپردگی" کی شرعی دلیل پیش کیجئے۔ اور شرعی سے میری مراد قرآن حکیم کی کوئی واضح اور قطعی الدلالۃ آیت یا نبی اکرم کا کوئی بین فرمان ہے۔ رہا صحابہ کا عمل سو اس کے متعلق دو باتیں عرض ہیں۔ اول یہ کہ اصحاب کا عمل حجت مطلقہ نہیں۔ یعنی آپ اس عمل کو مستقل اور علٰحدہ دلیل بنا کر پیش نہیں کر سکتے البتہ کسی دوسری حجت کی تائید وحمایت میں اُسے ضرور پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" (اللہ، رسول اور اولی الامر سب کی اطاعت کرو) اطاعت میں سب برابر ہیں۔ اور اگر کسی امر میں اختلاف ہو جائے اور نزاع یہ ہو کہ کسی خاص مسئلہ کا حکم شرعی کیا ہے تو ایسی صورت میں اس کو طے کرنے کی راہ صرف یہی ہے کہ اللہ اور رسول سے فیصلہ چاہا جائے۔ اور صرف انکی طرف رجوع کیا جائے:۔ "فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول (اگر کسی چیز میں اختلاف ہو تو صرف اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو) دیکھئے یہاں اولی الامر کا ذکر نہیں اب جبکہ مسئلہ امارت کی حیثیت بھی یہی ہے۔ میرا مولانا مودودی اور دوسرے اہل نظر سے اختلاف ہے۔ تقاضائے ہوشمندی یہ ہے کہ اس صورت میں بھی عمل صحابہ کا ذکر نہ کیا جائے بلکہ خالص حکم الٰہی اور سنت رسول کو سامنے رکھ کر بحث کی جائے۔

دوسرے مطلق صحابہ کا عمل بھی کوئی حجت نہیں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس عمل کی شرعی بنیاد بھی ہے۔ میرا منشا یہ ہے کہ اصل دلیل تو نص شرعی ہی ہے۔ البتہ جہاں واضح احکام نہیں وہاں اصحاب کے عمل کو بھی حجت سمجھ لیا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ضرور کسی غیر واضح حکم کو سامنے رکھ کر عمل کیا ہوگا۔ مگر یہاں

ایسا نہیں۔ میں اپنے مضمون میں اس کی کسی قدر تفصیل دے چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ سب سے پہلے ایک امیر کا انتخاب اتنی عجلت میں ہوا کہ مسئلہ کے تمام پہلو سامنے نہ آسکے۔ اور سب اہل رائے وہاں موجود بھی نہ تھے کہ مسئلہ کے تمام گوشوں پر نظر فرماتے۔ اس کے بعد جب کبھی یہ مسئلہ سامنے آیا اتفاق سے ایک عام عمرانی ہیجان اور سیاسی بے چینی کے حالات پیدا ہو گئے۔ کبھی حضرات صحابہ کرام کو سکون دل و دماغ کے ساتھ اس پر غور و فکر کرنے کا موقع نہ ملا۔

پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ جس رائے کا میں اظہار کر رہا ہوں وہ کوئی نئی رائے ہے اور صحابہ و تابعین میں سے کوئی بھی اس کا ماننے والا نہیں۔ حضرت علی کے عہد ہی میں نیک دل مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو امیر کے انتخاب کو شرعاً ضروری ہی نہیں سمجھتی تھی۔ مگر تاریخ نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اور ان پر خوارج کا ٹھپہ لگا کر ان کو اسلام کی جماعت سے گویا الگ کر دیا۔ آج یہ ٹھپے حق اور سچائی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ رجال کو حق و صدق سے پہچانا جائے، حق و صدق کی معرفت رجال سے حاصل کی جا رہی ہے۔ پھل سے درخت جانا جاتا ہے مگر یہاں درخت دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا رہا ہے کہ پھل کیا ہے اور کیسا ہے۔ مگر تاریخ ہی یہ بتاتی ہے کہ یہ حضرات بڑے پکے مسلمان تھے۔ راتوں خدا کی یاد میں بیدار رہتے تھے اور کلمۂ حق پڑھتے ہوئے اپنی جانیں اس کی راہ میں قربان کر دیتے تھے۔

کچھ عالم ایسے بھی ہیں جو خاص اس مسئلہ میں ان حضرات کے ہمنوا ہیں اور تاریخ نے ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور جلالت شان کا اعتراف کیا ہے۔ مشہور لغوی و ادیب ابو العباس المرد کا بیان[1] ہے کہ جلیل القدر فقہاء کرام کی ایک جماعت یہی عقیدہ رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ مشہور سحر بیان مقرر حسن بصری حکومت و امارت کے قایل ہی نہ تھے۔ مبرد نے عکرمہ کو بھی، جو حضرت ابن عباس کے مولا تھے اور فقہ و حدیث میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، اس جماعت کا ایک فرد بتایا ہے۔ اسی بنا پر ذہبی وغیرہ علماء رجال نے ان کو خارجی کہا ہے اور تو اور مشہور عالم، امام، اور محدث یعنی مالک بن انس کو بھی (مبرد کے بیان کے مطابق) اس جماعت میں شامل سمجھا گیا ہے

میرا خیال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو چھ اکابر صحابہ کا ایک بورڈ مقرر کیا تھا وہ نصب امامت یا انتخاب خلیفہ عام کی غرض سے نہ تھا، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جا رہا ہے بلکہ یہ دراصل خلافت شوریٰ کے لئے تخم ریزی کی گئی تھی۔ مگر سوء اتفاق سے ان حضرات نے آپس کے مشورے سے یہی مناسب سمجھا کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ چن لیا جائے۔ حضرت عمر ہی نے حضرت ابو بکر کے انتخاب کو ایک عاجلانہ فعل قرار دیا تھا۔ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ وہ اس باب میں کوئی بہت ہی گہری اور عمیق رائے رکھتے تھے۔ اکثر روایات میں ہے کہ وہ

---

[1] ملاحظہ فرمایئے الکامل جلد ۳ صفحہ مطبوعہ مصر

امارت کے باب میں بہت غور و فکر کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے انھیں اکثر اس میں غلطاں و پیچاں پایا۔ اتفاق سے اسوقت شرح عقاید نسفی کے سوا، جو عقاید و کلام کی متداول اور مشہور درسی کتاب ہے، میرے پاس اور کوئی کتاب نہیں اس میں ایک مقام پر یہ الفاظ ہیں:۔ "ثم استشہد عمر و ترک الخلافۃ شوریٰ بین ستۃ نفر" (حضرت عمر شہید ہوئے تو آپ نے خلافت کو چھ افراد کے درمیان شوریٰ قرار دیا) ان الفاظ کے سیدھے سادے معنی یہی ہیں کہ اصل خلافت کو شوریٰ قرار دیا گیا تھا نہ کہ انتخاب خلیفہ کو۔ ایک دوسرے مقام پر ہے:۔ "ولھذا جعل عمر الامامۃ شوریٰ بین الستۃ مع القطع بان بعضھم افضل من بعض" (حضرت عمر نے یہ جانتے ہوئے کہ بعض افضل ہیں اور بعض مفضول خلافت کو ان چھ افراد کے درمیان شوریٰ قرار دیدیا) اس پر پھر خود ہی اعتراض کیا ہے کہ امامت چھ افراد کے درمیان شوریٰ کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ ایک زمانہ میں دو امام مقرر نہیں ہو سکتے اس طور پر کہ الگ الگ دونوں کی اطاعت واجب ہو۔ "اما فی الشوریٰ فالکل بمنزلۃ امام واحد"۔ لیکن جہاں تک مشورے (کونسل) کا تعلق ہے وہ سب مل جل کر ایک ہی امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سوال و جواب سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے ان چھ افراد کا ایک بورڈ اس لئے بنایا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں باہمی مشورہ کریں اور اسکے بعد فیصلہ فرمائیں نہ یہ کہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر عام منتخب کر لیں۔

ادھر یہ امر بھی کچھ کم اہم نہیں کہ ابن خلدون کے بیان کے مطابق ایک جماعت کی رائے ہے کہ صحابہ نے جو ایک امیر کا انتخاب فرمایا وہ شرعی بنیاد پر نہ تھا۔ عقلی فیصلے سے مجبور ہو کر انھوں نے ایسا کیا تھا۔ انکے الفاظ یہ ہیں:۔ "وان الاجماع الذی وقع انما ھو فقاء بحکم العقل (یہ جو صحابہ کا اجماع ہوا یہ عقلی فیصلہ کی وجہ سے ہوا) اس لئے بھی اسے اجماع شرعی[1] نہیں کہا جا سکتا۔ آخر میں یہ بھی عرض کر دیا گیا تھا کہ اگر صحابہ کا یہ اتفاق اجماع ہی تھا تو پھر وقتی ضرورت کے لحاظ سے تھا۔ اب چونکہ وہ ضرورت نہیں اور نہ وہ حالات و مقتضیات ہی ہیں اسلئے اس اجماع کی وہ حیثیت بھی نہیں۔ اب حالات و مقتضیات کا تقاضا ہے کہ کسی فرد واحد کو امیر عام اور جماعت کے کسی فرد کو اس کا قائد مطلق بنایا ہی نہ جائے۔

اس سلسلہ میں ہمارے ناقدوں نے اور خصوصیت کے ساتھ مدیر کوثر نے یہ جذباتی بات بھی کہی ہے کہ میں نے حضرات صحابہ کی بابت یہ لکھا ہے کہ انھیں ٹھوکر لگی یا انھوں نے اسلام کو غلط سمجھا۔ یہ بات عام مسلمانوں کے جذبات بھڑکانے کے لئے کہی گئی ہے اور یہی ایک بات اس امر کی واضح شہادت ہے کہ مولانا مودودی جن اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور "جس رنگ میں وہ مسلمانوں کو رنگ دینا چاہتے ہیں" (برانہ مانئے

---

[1] "لابد فی الاجماع من داع مقدم وھو قد یکون خبر الواحد او القیاس"۔ (تفسیر احمدی صفحہ ۱۸۳)

ابھی تک ان تعلیمات کا یا اس رنگ کا مولانا صاحب اور ان کے رفقاء کی زندگی ہی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ابھی تک (مولانا نذیر الحق کے الفاظ میں) وہ اپنی زندگی سے منافقت کو خارج نہیں کر سکے۔ اب تک با ایں ہمہ دعوائے تبلیغ واشاعت انھیں اسلامی اخلاص، اسلامی بلندیٔ اخلاق، اسلامی تہذیب نفس سے ویسا ہی حرمان ہے جیسا وہ دوسرے مسلمانوں میں دیکھ رہے ہیں۔ اسلام بہت بلند چیز ہے۔ اس کا پرستار بننے کے لئے بڑے شدید مجاہدے اور محاسبے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام زندگی و اخلاق کا ایک نہایت جامع نظام ہے۔ اس میں سیاسی، اجتماعی، ثقافتی، اخلاقی، معاشی، قریب قریب انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق زندہ قدروں پر بہت زور دیا گیا ہے۔ مگر اخلاق کا باب اسلام میں نہایت وسیع اور اس کی تعلیمات کا گویا مرکزی باب ہے۔ بلکہ ارشاد نبوی کے مطابق "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" (میں تکمیل اخلاق کے لئے آیا ہوں) حضور کی بعثت اور تبلیغ اسلام کی غرض اولین ہی معیار اخلاق کو بلند کرنا ہے۔ باقی دوسرے شعبوں میں بڑی لچک ہے۔ ان کی قدریں گزراں و متحرک ہیں۔ اسلام کی برتری یہ ہے کہ اس نے زندگی کے ان شعبوں اور ان کی قدروں کو رواں و دواں سیلاب زندگی کا ہمدوش قرار دیا ہے۔ مولانا مودودی کے مشن کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ رواں و دواں اور غیر قار (Dynamic) قدروں پر کچھ اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کو ساکن، جامد اور قار (Static) سمجھے ہوئے ہیں۔ اور ان کے یہاں اخلاق میں اتنی لچک ہے کہ وہ اور ان کے رفقاء جو چاہیں لکھ دیں اور چھاپ دیں مگر ان کی اسلامیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

میں نے مسئلہ کی اسلامی حیثیت سے بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں شخصیتوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بات کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی نظر سے اوجھل ہو جائے۔ آخر وہ بھی تو صحابی ہی تھے جنھوں نے کہا تھا "منا امیر ومنکم امیر" (ایک امیر تمھارا ایک ہمارا) وہ بھی تو صحابی ہی تھے جو یہ فرماتے تھے کہ معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) قرآن کریم سے خارج ہیں۔ اس لئے یہ سورتیں قرآن میں نہ ہونا چاہئیں۔ آپ ان کی بابت کیا کہیں گے؟ کیا صحابہ کا آپس میں اختلاف نہ تھا۔ کیا ان میں تلواریں نہیں چلیں۔ کیا آپ سب کو حق پر سمجھتے ہیں؟ البتہ اجماع کے متعلق خود میں نے اپنے مضمون کے آخر میں عرض کر دیا تھا کہ:۔ "اگر اسے اجماع تسلیم بھی کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ اُس زمانہ کے حالات و مقتضیات کے مطابق ہوگا۔ اور اب جبکہ حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں اور زمانہ کہیں سے کہیں پہونچ گیا ہے یہ اجماع ہمارے لئے کوئی حجت یا کم از کم حجت شرعی نہیں" یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ میں خواہ مخواہ اصحاب کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا بلکہ میں ان علماء کاروں کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہوں جو اسلامی تعلیمات کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود جہاں اپنا مطلب نکلتا دیکھتے ہیں اسلام کے اصل اُصول کو چھوڑ کر ان حضرات کے دامن میں پناہ لینے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ بعض نقادوں نے اس سے زیادہ بے باکی سے کام لیا ہے۔ ایک صاحب نے لکھا ہے :-
" شوکت صاحب کے بیان کا مفاد یہ ہے کہ اسلام اور قرآن کے واسطے سے جو دعوت دیجائے وہ باطل ہوتی ہے"۔
ایک دوسرے بزرگ نے جو بدقسمتی سے میرے ہموطن ہی نہیں بلکہ محترم دوست بھی ہیں، اس پر یہ فیصلہ فرمایا ہے۔
" معلوم ہوتا ہے ان کو (یعنی مجھ کو) اسلام اور قرآن کے نام سے چڑ اور نفرت ہے"۔ اس کے بعد یہی صاحب تحریر فرماتے ہیں " کاش پروفیسر صاحب غلط اور صحیح میں تمیز فرماتے"۔ ایک اور صاحب جو غالباً ذاتی طور پر مجھسے واقف بھی ہیں مجھے " نادان دوست " بتاتے ہیں۔ ایک اور ہمدرد اسلام نے " گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا " والی پھبتی کہی ہے۔ کہاں تک تفصیل کی جائے۔ لفظ لفظ سے بغض، عداوت، سوء فہم، اور قوت فیصلہ کا ڈھیلا پن ٹپکا پڑ رہا ہے اور سر پیٹ لینے کی جا ہے کہ یہ سب وہ لوگ ہیں جنھوں نے مودودی اسکول میں اسلامی بلند نظری، اخلاقی رفعت اور صدق و اخلاص کی تعلیم پائی ہے اور جس شخص کی بابت یہ الفاظ لکھے گئے ان حضرات میں سے کم از کم دو صاحب ذاتی طور پر اس سے واقف بھی ہیں اور اب تک کبھی اسے ان خطابات کا اہل نہیں سمجھا گیا ہے۔

میں ان حضرات کی اس یاوہ گوئی (معاف کیجئے گا) کا کبھی بُرا نہ مانتا اگر یہ مدعی اخلاق و تعلیمات اسلامی نہ ہوتے جن صاحب نے مجھے نادان دوست لکھا ہے انھیں شاید معلوم نہیں کہ انسان ہونے کی حیثیت سے ہم سبھی نادان ہیں۔ کوئی نادان دوست ہے تو کوئی نادان دشمن " وما اوتیتم من العلم الا قلیلا " (انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے) انسان کیا اور اس کا علم کیا۔ البتہ ایک نادان کی زبان و قلم سے یہ الفاظ کچھ بے محل نظر آتے ہیں :-

لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

میں نے ہرگز یہ نہیں لکھا کہ اسلام اور قرآن کے نام سے جو دعوت دیجائے وہ باطل ہوتی ہے۔ بلکہ میں نے یہ لکھا تھا کہ ماضی میں بھی اسلام کے نام سے باطل دعوتیں دی گئی ہیں۔ اور یہ بات مولانا نذیر الحق صاحب کو بھی تسلیم ہے۔ اب رہا تمیز کا سوال سو اگر وہ تمیز نہ کر سکے تو اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ کوئی دوسرا بھی تمیز نہ کر سکے گا۔ اگر مولانا مودودی درحقیقت مبلغ اسلام ہیں تو وہ اسلام کی تبلیغ اسلام کے اصول ملحوظ رکھکر کریں۔ اس کو دوسرے مقاصد کے لئے آڑ نہ بنائیں۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ وہ اسلامی اصول، عقائد اور اخلاق کو چھوڑ کر اس کے سیاسی و معاشی پہلوؤں پر (جو علامہ اقبال اور دوسرے مفکرین اسلام کے نزدیک آئے دن بدلنے والی حقیقتیں ہیں) زیادہ زور دے رہے ہیں۔ کیا اس سے بدگمانی کے لئے راہ نہیں کھلتی ؟ میں خود ان تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا اور نہ یہ باتیں واشگاف کہی جا سکتی ہیں۔ مولانا نذیر الحق نے مودودی صاحب کی دعوت کے تین نقاط (نذیر الحق صاحب کے الفاظ میں) بتائے ہیں :-

(۱) بندگان خدا کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص ایک خدا کی بندگی -

(۲) مسلمانوں کی زندگی سے منافقت دور کرنا اور ان کو اسلامی رنگ میں رنگنا۔

(۳) عملی و نظری حیثیت سے امامت و رہنمائی مومنین صالحین کے ہاتھ میں دینا۔

یہ نقاط بہت کچھ غیر واضح ہیں۔ ایک خدا کی بندگی کہنے کو سبھی کرتے ہیں۔ آریہ سماجی اور مسیحی بھی اپنے کو موحد بتاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو پیر پرست ہیں۔ اور خدا کے فضل سے آپ بھی جو امام، خلیفہ، یا امیر کی اسی طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح ایک خدا کی اطاعت کی جاتی ہے۔ آپ میں اور یہود و نصاریٰ میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور عالموں کی ایسی ہی اطاعت کی تھی تو خدا نے ان کی بابت فرمایا: "اتخذوا احبارہم ورہبانہم ارباباً من دون اللہ" (انھوں نے اپنے عالموں اور عابدوں کو خدا سے الگ رب بنا رکھا ہے) آپ زبان سے تو یہ فرماتے ہیں کہ ہم "معروف" میں امیر کی اطاعت کرتے ہیں۔ مگر آپ کا عمل اس کے خلاف ہے۔ اس باب میں آپ اپنی دعوت کے دوسرے نقطہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہی منافقت ہے جس کے استیصال کے مولانا مودودی اور آپ کھڑے ہوئے ہیں۔ کیسی ڈھٹائی ہے کہ جب آپ کے امیر کو لکھا جاتا ہے کہ جس چیز (مسئلہ امارت) کو آپ اسلامی سمجھ رہے ہیں اسلام اور قرآن کی روح اس کے منافی ہے، تو ایک طرف آپ کے امیر اس کی اشاعت سے پہلوتہی فرماتے ہیں اور دوسری طرف آپ اسی غیر اسلامی چیز کو محض اپنے اسلاف کی تقلید میں "مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا فارمولا" بتاتے ہیں۔ کیا یہی وہ 'معروف' ہے جس میں امیر کی اطاعت کے لئے آپ مجبور ہیں۔ صاف الفاظ میں یوں کیوں نہ کہئے کہ جو کچھ آپ کا امیر کہے دراصل 'معروف' وہی ہے۔ اور معروف میں آپ اطاعت کرتے ہی ہیں اس لئے آپ بہر حال اپنے امیر کی اطاعت کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ یہ ہے گفتار و کردار کا فرق جسے شاید مذہبی ادبیات میں منافقت کہا گیا ہے۔ جب خود آپ کا یہ حال ہے تو آپ دعوت اصول اسلام کیا خاک انجام دے سکیں گے۔

شرک دو طرح کا ہے۔ ایک شرک فی الربوبیت دوسرے شرک فی الرسالت۔ آپ کی امامت و امارت اگر شرک فی الربوبیت نہیں تو شرک فی الرسالت ضرور ہے۔ خدا کے سوا در اصل کسی دوسرے کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی مگر اس صورت میں، جبکہ خود خدا اس کی اطاعت کا امر فرمائے۔ نبی کی اطاعت امر الٰہی ہی کی وجہ سے ہے اور اولی الامر کی مشروط اطاعت کا حکم بھی خدا ہی نے دیا ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ آپ ایک امیر کی اطاعت خدا کے کس امر و فرمان کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔ اگر آپ کے پاس اصحاب کے عمل اور اسلاف میں سے بعض حضرات کے قول کے سوا کوئی شرعی نص اور فرمودۂ رسول نہیں تو آپ معلوم نہیں اسے کیا کہیں، میں تو شرک فی الرسالت کہتا ہوں۔

اس کے علاوہ ایک مسلمان کو خالص مسلمان بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ ایک نبی کا کام ہے بلکہ نبی کے اختیار سے بھی باہر ہے۔ قلب پر صرف خدا ہی حکومت کرتا ہے "انک لا تھدی من احببت ولاکن اللہ

یہدی من یشاء" (اے نبی آپ جسے چاہیں راہ راست نہیں دکھا سکتے البتہ خدا جسے چاہتا ہے اس کی آنکھیں کھول دیتا ہے) یہ قرآن میں ہمارے آخری نبی کو خطاب کر کے کہا گیا ہے۔ یاد رکھئے کہ انبیاء اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے داعی اور مبلغ صرف صحیح اور سچے اُصولوں کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور ان کے مشن کی کامیابی یہ ہے کہ لوگ ان اُصولوں کو سچا مان لیں اور باطل اُصول کی غلطی اور بطلان ان پر ظاہر ہو جائے۔ زندگیوں میں انقلاب پیدا کرنا ایک عام مبلغ اور داعی کا تو ذکر ہی کیا ہے نبی کے بس کی بات بھی نہیں۔ دور کیوں جائیے پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے اپنے میں کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ آپ خود اپنے اعمال و افعال کا جائزہ لیجئے۔ خود آپ میں وہ نارسائیاں نکل آئیں گی کہ آپ بحر ندامت میں غرق ہو جائیں۔

آپ کے تیسرے نقطہ کی حیثیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ابھی یہ طے نہیں کیا جا سکا کہ مومن صالح کی شان کیا ہے ابھی آپ اس کا کوئی معیار مقرر نہیں کر سکے۔ آپ کہتے ہیں کہ مومن صالح آپ ہیں اور میں کہتا ہوں کہ مومن صالح وہ ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر اپنی زندگی کو اس کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق بنا لیا ہے۔ اسلام علم و عمل کا دین ہے۔ اسلام میں علم سے زیادہ عمل کی اہمیت ہے اور عمل سے زیادہ علم کی۔ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے جس طرح عالم بے عمل عقوبت و سزا کا مستحق ہے اسی طرح وہ زاہد و عابد بھی جس کے ذہن و دماغ میں علم کی شمع روشن نہیں ہے۔ آپ شخصیتوں کے اعمال و افعال کا وزن نہ کیجئے۔ اور اگر آپ نے ایسا کیا تو سب سے پہلے آپ کو وہ ترازو پیش کرنا ہو گی جس میں یہ اعمال وزن کئے جاتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے اشخاص و افراد کے سوال کو الگ کر کے صرف اُصول سامنے رکھے ہیں۔ حق و باطل دو راہیں ہیں۔ ہم صرف ان راہوں کو جانتے ہیں۔ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ یہاں سے باطل راہ کا موڑ شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن حق کے مختلف منازل کی نشاں دہی اگر ممکن ہے تو ہمارے حدود اختیار سے باہر ہے۔ ہمارا فرض یہ نہیں کہ ہم ان منازل کی نشاں دہی کرتے پھریں اور یہ بتائیں کہ کون کس منزل سے گزر رہا ہے۔

مولانا مودودی کی نیت پر اس لئے بھی شبہ کیا جاتا ہے کہ وہ کچھ اس نوع کا غیر ضروری جائزہ لے رہے ہیں خود تمام حدود و قیود سے بالاتر ہو کر ایک حاکم اعلیٰ کی طرح ہر شخص پر جرح و قدح کا نشتر چلا رہے ہیں۔ اسلام جو کچھ چاہتا ہے اس سے زیادہ ان کے کچھ اور مطالبے بھی ہیں۔ وہ خود ایسا کام کر رہے ہیں۔ جس کی کامیابی مشتبہ ہے لیکن دوسروں کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔ اپنی ان کمزور نگاہوں سے انسانوں کو باطن میں جھانکنا چاہتے ہیں۔ یہ دراصل ایک طرح کا استقصاء اور "جور فی الاحکام" ہے۔

مجھ پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ میں نے مودودی نظریۂ امارت کا عنوان قرار دیکر ایک ایسے نظریہ کو جو دراصل تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے مودودی صاحب کے سر تھوپ دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ 'مودودی نظریۂ امارت' میرا قائم کیا ہوا عنوان نہیں ہے میں نے مودودی صاحب کو جب یہ مضمون بھیجا تھا تو اس کا عنوان اسلام اور مسئلہ امارت تھا۔

اسی عنوان کے ساتھ مولانا نیاز کو یہ مضمون بھیجا گیا تھا مگر نیاز صاحب نے اس کا عنوان بدل دیا۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ کوئی بیجا بات نہ تھی۔ مولانا مودودی اور انکے رفقاء کا یہ کہنا۔ اور اب اس آزادی اور جمہوریت کے عہد میں۔ کہ کسی امیر کا مقرر نہ کرنا غیر اسلامی اور جاہلانہ فعل ہے، اس نظریہ کو مودودی نظریہ بنا دیتا ہے۔ دوسرے بزرگ شاید یہ نہیں کہتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ امیر کا تقرر اسلامی چیز ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں نے اس کا تقرر کیا ہے لیکن اس کا تقرر نہ کرنا کوئی جاہلی فعل نہیں۔ اس لئے کہ کسی فرد واحد کی امامت اسلام کا کوئی اُصول نہیں۔ اسلام جمہوری نظام کا حامی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ترکی کے علماء و فقہاء نے جمہوری نظام ہی کو اسلام کا سیاسی نظام قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اقبال کی تحریر ہے، جس کا اقتباس میں اپنے مضمون میں دے چکا ہوں، کہ ہندوستان اور مصر کے علماء نے اس وقت تک اس نقطۂ پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ یعنی یہ کہ خلافت و امامت ایک منتخب جماعت کو بھی سپرد کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ لیکن مولانا مودودی اور ان کی جماعت یہ اعلان کر چکی ہے کہ منتخب جماعت کی امامت سرے سے غیر اسلامی چیز ہے۔ بتایئے آپ اس کو مودودی نظریہ نہ کہیں تو کیا کہیں گے۔

اس مسئلہ کا اگر علمی طور پر تجزیہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل صورتیں نکلتی ہیں:۔

(۱) فرد واحد امام یا خلیفہ ہو سکتا ہے؟ — (۲) ایک پوری جماعت کو امام کی حیثیت سے منتخب کیا جا سکتا ہے؟

اور اس پر ذیل کی دو تنقیحات قایم کی جا سکتی ہیں:۔

(۱) ان دونوں صورتوں میں سے اسلام کے سیاسی نظام کے موافق کون سی صورت ہے؟

(۲) دنیا کے سیاسی حالات کے پیش نظر اب کیا ہونا چاہئے؟

مولانا مودودی اور ان کی جماعت کا خیال ہے کہ (الف) فرد واحد ہی امام منتخب ہو سکتا ہے۔ (ب) یہی اسلام کا سیاسی نظام ہے۔ (ج) اور اب بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کا عقیدہ ہے (اور یہی میں بھی کہتا ہوں) کہ گو چند اسلامی تاریخ میں فرد واحد کو بھی امام منتخب کیا گیا ہے مگر اسلام کے سیاسی نظام اور اس کی روح تعلیم کے موافق یہی ہے کہ امامت ایک بورڈ یا جماعت کے سپرد کی جائے بلکہ دنیا کے سیاسی حالات کے پیش نظر یہ اسلام کی ایک اہم ضرورت بھی ہے — علماء اسلام میں سے مصر و ہندوستان کے عالموں نے اب تک اس مسئلہ پر ان تفصیلات کیساتھ بحث نہیں کی۔ البتہ ترکی کے علماء و فقہاء وہی کہتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے۔ میں نے اسکو کسی قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی مودودی جماعت کے لوگ یہی کہیں گے کہ مودودی صاحب کا نظریۂ امامت وہی ہے جو دوسرے علماء اسلام کا ہے؟ — میں تنقید کرنے والوں کے تمام ضروری شبہات پر بحث کر چکا ہوں۔ لچر اور پوچ باتیں بالقصد چھوڑ دی گئی ہیں۔ آیندہ ایسی ہی کوئی غیر محققانہ اور جاہلانہ تحریر شایع ہوئی تو اس کا جواب نہ دوں گا۔

(پروفیسر) شوکت سبزواری

چوڑیاں

چھ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں — پوری چھ — آنسوؤں کے دھندلے آبگینے سے وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ جھانک رہی تھیں۔ لیکن ان کی نظریں انھیں موتیوں کی لڑیوں میں اُلجھ کر رُک جاتیں — جیسے ایک مہین جالی کا ملگجا پردہ ان کے بیچ میں تھرتھرا رہا ہو — بعد کو یہ آٹھ ہوگئیں — دو ننھے موٹے موٹے بوجھل پپوٹوں کو جنبش ہوئی — چھوٹی چھوٹی ٹیڑھی پلکیں پھڑکیں — زیبو کی آنکھوں سے گرتے ہوئے پانی کے قطروں کو دیکھ کر گود میں بیٹھے ہوئے ننھے نے بھی بے سمجھے بوجھے چند چمکدار ستارے اس کے دامن کی نذر کر دئے۔

بڑھی کا پوپلا منہ ہلا، سُتے ہوئے چہرے کی جھریاں بیک وقت ایسی اُبھریں جیسے تالاب کے کنارے سوکھی اور چکنی زمین کی دراڑیں پاؤں رکھنے سے اور تڑخ جائیں۔

"بیٹا، بڑے کٹھور ہوتے ہیں یہ شہر والے — دل ہی نہیں ان کے سینے میں — گاؤں والوں کو تو وہ کتے کی برابر سمجھتے ہیں۔ تیرا باپ تو کہتا تھا کہ شہر والوں کا بھگوان ہی مرگیا ہے۔ وہ تو صرف دھن کو پوجتے ہیں۔" بوڑھی نے ایک ہی سانس میں اتنی باتیں کہہ دیں — پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے رُکی — بیس برس پہلے کے دن اسکی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ جب ننھے کی طرح اس کا باپ بھی انگنائی میں کھسکتا ہوا گھڑونچی پر رکھی ہوئی ہنڈیا کے گرانے کی ناکام کوشش کرتا تھا — پھر اس کی نظروں میں وہ اُداس اور بھیانک منظر آیا جب اس کا شوہر بھی شہر کے سرکل انسپکٹر کے پاس پولیس کا جوان بن کر جا رہا تھا — وہ بھولی بسری باتوں کی یاد میں اس طرح گم ہوگئی کہ لمحہ بھر کے لئے اپنے بیٹے کے پردیس جانے کا خیال بھی اس کو نہ رہا — اس کی نظروں میں اس کا بیٹا تو وہی بیس سال پہلے کی طرح اب بھی آنگن میں گھڑونچی کے سہارے کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑھی کی آنکھیں کسی نامعلوم مسرت سے کچھ اور پھیلیں۔ اس کی جوانی کے بھولے ہوئے خواب مجسم ہوگئے اور اس کو خیال آیا کہ ایک صبح کس طرح اس نے سفید اور باریک باریک سیویاں اُبال کر اپنے شوہر رحیم کو اپنے ہاتھوں سے کھلائی تھیں اور رحیم نے اس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا تھا:۔ "یہ ہاتھ بھی تو گورے ہیں سیویوں کے مانند" — لیکن فوراً ہی وہ چونکی۔ اس کو اپنے بیٹے کی جدائی کا خیال آگیا — پھر اس نے کچھ سوچ کر اپنی مسلسل ہلتی ہوئی گردن کو بہت ہی متفکرانہ انداز سے جنبش دی — بیٹا اور بہو بھی تو جوان ہیں ——— اور — وہ وہاں سے کھسک گئی۔

مدھار اور زیب چپ چاپ کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ بوڑھی ماں کو کوٹھری میں جاتا دیکھ کر مدھار آگے بڑھا — پہلے ننھے کو چوما — پھر اپنے دامن سے زیب کے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے بھینچ کر اسکو اپنے سینے سے لگا لیا — زیبو، مدھار کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھے ہوئے لمحہ بھر بعد چھین لی جانے والی خوشیوں کا خاموش ماتم کر رہی تھی — وہ آنے والی کالی کالی اور برھا کی تڑپا دینے والی راتوں اور چوکھٹ پر چٹھی کے انتظار میں پتھرائی ہوئی نظروں کے تخیل میں گم تھی — اس کو ایسے معلوم ہوا جیسے جنگل کی ساری کوئلیں ایک ساتھ کوک اٹھی ہیں۔

"زیبو، خوشی خوشی رخصت کرو — تمہارے لئے چوڑیاں خرید کر لاؤں گا — تم کب سے مانگ رہی ہو — وہ عید بھی تو گزر گئی — اری شہر کی چوڑیاں یہاں کی چوڑیوں کی طرح تھوڑی ہوتی ہیں — موٹی موٹی جیسے کانچ کی ہتھکڑیاں اور ہاں میرے ننھے کے لئے بہت سی مٹھائی — کھلونے —" مدھار مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔

مدھار، ماں کے چرن چھو کر گھر سے نکل گیا۔ گلی کی موڑ پر غایب ہونے تک دو نظریں اس کا پیچھا کرتی رہیں — بھیگی ہوئی — نم اور شبنمی — کائنات کہر اور دھندلکے کی آبی چادر میں لپٹی ہوئی تھی — گھٹائیں آسمان پر چھائی ہوئی تھیں — بارش تھم چکی تھی اور درختوں کے پتوں پر جمی ہوئی بوندیاں ہوا کے نرم اور لطیف جھونکوں سے کبھی کبھی زمین پر ٹپک پڑتیں۔

"نوکری پر جا رہے ہو مدھار بھیا" گردھاری نے اپنی اودی کور کی نئی دھوتی کو دیکھ کر کہا — "مگر یہ تمہارے کدھر کے ٹھاٹھ باٹھ ہیں — وہ گوالن کی چھوری! کیا چل گیا داؤں اس پر؟" — مدھار نے اپنے سینے کی خلش کو چھپا کر مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بات کاٹ دی — "ارے غریبوں کا ٹھاٹھ باٹھ کیا مگر ساون میں کون شوق نہیں کرتا — مدھار — ذرا دو بیڑے تو لگانا پنواڑی" — اپنی جیب میں سینے سے چمٹی ہوئی اکنی کا خیال کرتے ہوئے گردھاری نے ذرا اکڑ کر بازو کی دوکان پر بیٹھے ہوئے پنواڑی کو حکم دیا — اور پھر گفتگو کے اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا "اجی اس پر تو سیٹھ بھگوان داس کا چھورا ڈورے ڈال رہا ہے — مگر یہ تو بولو مدھار بھیا اس ساون رت میں پردیس کی کیا سوجھی ہے" — اس نے بات کا موضوع بدلا — "پیٹ اور روٹی کی بات ہے گردھاری — ساون تو کھاتے پیتوں کا ہے" — "ڈلی تو ایک ہی پان کی دی سیٹھ جی" — گردھاری نے پنواڑی سے چھالیہ لے کر اکنی اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا: — "شام ہوتی ہے رخصتی دو گردھاری۔ اجالا چھپنے سے پہلے ریل گاڑی کے اڈے پر جانا ہے" مدھار نے کہا — "چھٹی ضرور لکھنا" — گردھاری نے مدھار کو گاؤں کی فصل کے پاس بیری کے خشک پیڑ کے پیچھے غائب ہوتے دیکھ کر چلا کر کہا — مدھار چل پڑا۔ اس کا ہر قدم پر اضطراب لیکن ساتھ ہی تسلی بخش بھی تھا۔ انحطاطِ مسرت کی یہ سکون پرور خلش — اور لجائی ہوئی سی خوشیاں — سینے میں گھستے اور دم توڑتے ہوئے دلولے — دماغ میں جذبات کی رینگتی اور لنگڑاتی ہوئی رو۔

آنکھوں کی سسکتی ہوئی چمک - ہونٹوں کا بسورتا ہوا تبسم — خوشی اور غم کے ملے جلے یہ جذبات - خیالات کے تیز بہتے ہوئے دھارے اس کے حال اور مستقبل میں آہنگ پیدا کرنے کی ایک نامعلوم کوشش کر رہے تھے - وہ سوچ رہا تھا - گہری سوچ میں برابر اس کے قدم اُٹھ رہے تھے - دماغ میں بیک وقت کئی خیالات کا تانتا بندھا ہوا تھا جیسے بہت سے بلوائی کسی تنگ گلی میں گھس گئے ہوں -

"اندھیرا ہونے سے پہلے پہونچ جانا ہے" یہ سوچکر اس نے رفتار تیز کر دی - "نہ جانے سیٹھ رام دیال کس طبیعت کا ہے - پہرہ کی نوکری ہوتی بھی تو کٹھن ہے" اس کے سامنے خالی تصویریں آنے لگیں - جیسے وہ رات کے سناٹے میں پہرہ پر کھڑا ہے - کسی ڈاکو نے شبخون مار دی اور وہ اس سے مقابلہ کر رہا ہے — خود بخود اس کے ہاتھ اکڑ گئے — پنجے بھنچ کر مکے بن گئے — پھر وہ چونکا ——— اور جو ڈاکو کئی ہوں — اس کے دل پر ایک غیر شعوری خوف طاری ہو گیا — اس نے محسوس کیا جیسے بندوق کی کئی گولیاں اس کے سر پر سے نکل گئی ہیں - اس طرح وہ نئے نئے گھروندے اپنے دماغ میں تعمیر کر رہا تھا — معلق — ادھر — ہواؤں میں تیرتے ہوئے - گھروندے بنتے اور فوراً ٹوٹ جاتے — لیکن وہ ہمیشہ تاریک پہلو پر کیوں غور کرے — وہ کیوں نہ ان گھروندوں سے محل بنالے - وہ بھی تو انسان ہے — دنیا کی خوشی میں اس کا اپنا بھی تو برابر کا حصہ ہے — اس نے فوراً ہی دیکھا کہ اس کو چھٹی مل گئی ہے — ننھے کی مٹھائی، کھلونے اور زیبو — زیبو کے لئے تو بہت سی ساڑیاں - بُندے - کاجل اور ہاں چنبیلی کا تیل بھی اور سب میں بڑھ کر پتلی پتلی چوڑیاں — ایک غیر ارادی مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر رقص کرنے لگی — آنکھیں بھیگیں، فضا اور زیادہ سرمئی ہو گئی — اور آنکھوں کے سامنے اودے، ہرے، پیلے کئی حلقے ناچنے لگے — کبھی وہ پھیل کر بہت بڑے ہو جاتے کبھی سمٹ کر بہت چھوٹے — انھیں حلقوں کے درمیان زیبو کی لال لال پتلی پتلی چوڑیاں نظر آئیں، جو خود بھی حلقوں کے ساتھ پھیل کر بہت بڑی ہو گئیں — "ٹوکرے کی ضرورت ہے بابو" بھیرا ندی کے مضطرب سینے پر ہچکولے لینے والی کشتی کے ملاح نے چپو سنبھالتے ہوئے پوچھا — مدھار چونکا — چھوٹے کالے اور دبلے پتلے بچوں کے سوکھے ہوئے تلوؤں کو چھوتی، ٹخنوں کو تھپتھپاتی ہوئی اور ان کو شانتی کی لوریاں دیتی ہوئی بہنے والی بھیرا اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بے پناہ وحشیانہ اور طوفان خیز قوتوں کے ساتھ بغاوت کے ترانے گا رہی تھی -

دور کناروں پر اُجلے اُجلے بگلے، کالے گندے انسانوں کی لٹی ہوئی محبت کو استہزا آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے - ایک شکرا کسی چھوٹے سے پرندے کو اپنے پنجوں میں دبوچے ہوئے اس کے نازک پروں کو نوچ نوچ کر ہواؤں میں بکھیر رہا تھا — پورب کی جانب مڑتی ہوئی بھیرا کے اس کنارے دور تک بکھری ہوئی ریت کو پانی کی بھیانک اور پرشور موجیں اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے پوری قوت سے آگے کو رینگ رہی تھیں - جیسے سیکڑوں

اژدھے پھنکارتے ہوئے بڑھ رہے ہوں۔

وہ کب کشتی سے اُترا — کب اسٹیشن پہونچا، کون جانے — انجن کی سیٹی سُن کر وہ اس وقت چونکا جبکہ ٹیڑھی اور لمبی گردن والا بمبا کالے کالے انجن میں پانی انگل رہا تھا — پاس کی رہنے والی عورتیں انجن کے نچلے حصّے کے گرتے ہوئے پانی سے اپنے گھڑے بھر رہی تھیں — دو چار مسافر اپنی میلی کچیلی گٹھریاں پلیٹ فارم پر رکھے گاڑی کے منتظر تھے — شام ہو چکی تھی اور کچھ فاصلے پر لال قندیل والا سگنل ایسے کھڑا تھا جیسے کوئی کانا دیو اپنی انگارہ جیسی آنکھ سے مسافروں کو تاک رہا ہو۔

دور چمکتا ہوا جگنو لمحہ بہ لمحہ کچھ زیادہ واضح بڑا اور روشن ہونے لگا — آخر ٹن ٹن ٹن گھنٹی بجی — زمین کی چھاتی دہلی — پٹریاں کانپیں — کچھ شور ہوا — بیک وقت کئی آوازیں گونجیں — اور پھر منٹ بھر بعد دھک دھک دھک کی بے معنی آوازیں آنے لگیں — جو آہستہ آہستہ ہواؤں کی لامتناہی وسعتوں میں گم ہو گئیں۔

(۲)

بلو پھٹ رہی تھی۔ مدھار کے جسم میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں — تازہ زخم ٹنکچر آیوڈین کے پھاہوں سے اور زیادہ جل رہے تھے — اس کی قوت حس بالکل معطل ہو چکی تھی۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ رات بھر اُس نے ایسے ہی تڑپ کر گزاری تھی اور وہ اب تک بے ہوش تھا۔ آپریشن روم سے نکل کر سرجن ایک کیبن میں ہوتا ہوا اس کے وارڈ میں پہونچا

"ابھی ہوش نہیں آیا اس غریب کو"؟

نئے مریض کے چارٹ پر اس کا نمبر وغیرہ لکھتے ہوئے نرس نے گردن ہلائی اور ہونٹوں سے ایک خاص آواز "چوچو" نکالتے ہوئے کہا "

سرجن نے ایک مایوس نگاہ مدھار کے بے ہوش جسم پر ڈالی اور وارڈ کے دوسرے مریضوں کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھ گیا۔

دس بجے کے قریب مدھار کو ہوش آیا۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھلیں۔ تھوڑی دیر تک اس کو کالی کالی پرچھائیاں سی نظر آئیں — گھر کی چارپائی — ترخی ہوئی کچی کچی دیواریں — الگنی پر پھیلے ہوئے ننھے اور زیبو کے کپڑے۔ مرغی کا دڑبا — اور اُس کے پاس اُپلوں کا ڈھیر — اس قسم کی تمام چیزیں آہستہ آہستہ اس کے حافظے میں رینگتی ہوئی اور پھر یہ سب اسپتال کی چھت اور دیواروں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہری ہری خوبصورت دیواریں اور سفید چھت! — وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اور غیر ارادی طور پر اس کا سیدھا ہاتھ آنکھوں کی طرف اُٹھتے اُٹھتے ایک ٹیس کے ساتھ گر گیا — نظریں چھت سے ہٹ کر جسم کی سفید سفید پٹیوں پر پڑیں، اور پھر ان پٹیوں پر خون اور ٹنکچر کے ملے جلے لال لال دھبے۔ ان دھبوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں زیبو کی لال لال چوڑیاں پھر گئیں۔

اس نے محسوس کیا کہ وہی لال لال چوڑیاں اس کے جسم پر جا بجا چمٹ گئی ہیں، اور اپنی پوری قوت سے بدن میں دھنستی جا رہی ہیں۔

ٹنکچر آیوڈین، کلوروفارم، سفید سفید پٹیاں، خون اور پیپ سے بھیگی ہوئی روئی، درد، کسک، ٹیسیں، بے خوابی آہیں، آنسو اور موت — وہ پورے دس دن اس ماحول میں گزار چکا تھا — اور آج دو مہینے کی اس طویل مدت کے بعد ڈاکٹر نیازی کو دعائیں دیتا ہوا، بیساکھیوں کے سہارے ہاسپٹل سے باہر نکل رہا تھا۔ خون اور پیپ سے بھیگی ہوئی روئی اور پٹیوں میں لپٹی ہوئی سیدھی ٹانگ اس نے ہاسپٹل کے آپریشن روم کے حوالے کر دی تھی۔

کتنا رحم دل ہے یہ ڈاکٹر بھی — بیساکھیاں بنوا دیں — کرائے سے کچھ زیادہ پیسے بھی اس نے دے دئے۔ مٹھائی کیوں نہ خرید لوں ننھے کے لئے — مگر نہیں مٹھائی تو وہاں بھی مل سکتی ہے۔ ارے چوڑیاں لے لوں لال لال پتلی پتلی اپنی زیبو کے لئے — مگر زیبو مجھے پہچان بھی لے گی؟ — جیسے ایک گولی اس کے کلیجے پر آ لگی۔ اس کی آنکھیں اپنے کٹے ہوئے پیر پر جم گئیں — اس کی پلکیں بھیگ گئیں — چند پانی کے قطرے زمین پر گر کر خاک میں جذب ہو گئے — پوں پوں ہارن کی آواز سے وہ چونک پڑا — اس کے دل میں بجلی کی تڑپ کی طرح انتقام کی آگ بھڑکی — مٹھیاں بھنچ گئیں — بیساکھیوں پر ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ جیسے اب وہ بیساکھیاں پھینک کر موٹر پر دے ہی تو مارے گا۔ موٹر فراٹے بھرتا ہوا اس کے پہلو سے نکل گیا — اس کے کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو اس نے دو ماہ پہلے رات کو ٹکر کھانے کے بعد سنے تھے اور سنتے سنتے بیہوش ہو گیا تھا کہ "راہ نہیں سوجھتی گدھے کے بچے کو، نہ جانے کس گاؤں کا ہے کاٹ کا اُلو جو سائیڈ بھی نہیں پہچان سکتا"

رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ ٹرین پلیٹ فارم پر رکی — لنگڑا رینگتا ہوا بیساکھیوں کے سہارے اُتر پڑا — گاؤں کافی دور تھا لیکن مچلتے ہوئے جذبے۔ اشتیاق کے بھڑکتے ہوئے شعلے — ان کو بھلا کون روک سکتا تھا، وہ چل پڑا اور بچپن کے مانوس راستوں پر اس کے قدم اُٹھنے لگے — رات بہت زیادہ بھیانک اور تاریک تھی اور پاس کی ٹوٹی ہوئی مسجد کے مینار پر اُلو بیٹھا ہوا بول رہا تھا۔

وہ آج سے دو ماہ پہلے کی طرح ہوائی محل بناتا اور منہدم کرتا انہیں راستوں سے لوٹ رہا تھا کہ مدھار کی نظریں پھر ایک بار اپنے پاؤں پر جم گئیں۔ وہ سوچنے لگا اگر نہ پہچانے مجھے زیبو تو — مگر نہیں وہ تو راہ دیکھ رہی ہوگی میری، چٹھی بھی تو نہیں بھیجی ہے نا میں نے — وہ چونک ہی تو پڑے گی میری آواز سن کر — لیکن یہ کٹا ہوا پاؤں — بڑا دکھ ہوگا اس کو میرا یہ روگ دیکھ کر — گلی کے موڑ پر اس کے دل کی دھڑکن بہت زیادہ تیز ہو گئی — بیساکھیوں کے بیچ میں لمحہ بعد ٹکنے والا جسم تھر تھر کانپنے لگا — گھر کے دروازہ پر وہ چپ چاپ پتھر کی چٹان بنا کھڑا رہا — آخر ہمت کر کے کنڈی کھٹکھٹا دی — وہ چاہتا تھا کہ زور سے زیبو کو پکارے

لیکن آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی ـــــ اس کے ہاتھ بھی برف کی طرح سرد ہو گئے ـــ وہ برابر کھٹکھٹا بھی نہ سکتا تھا پھر اس نے دل کڑا کیا ـــ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ ـــــ "کون ہے رے اس سمے"۔ زیبو کی پتلی اور رسیلی آواز رات کے سناٹے میں ایسے گونجی جیسے کسی نے ساز کے کئی تار بیک وقت چھیڑ دئے۔ لنگڑے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور اس نے زور زور سے کنڈی کھٹکھٹا دی۔

"اری تو ہی ہے چنچل رادھی، ہمیشہ ٹھٹھول ہی کرتی ہے چھوہڑ ـــ دستور ہی بنا لیا روز کا"۔

زیبو نے اپنی پڑوسن رادھی کے خیال میں بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھول دیا ـــ منڈیر پر رکھی ہوئی بتی کی مدھم مدھم روشنی کواڑ کے باہر گلی میں پھیل گئی ـــ زیبو کی نظریں بیساکھیوں کے بیچ میں ٹکتے ہوئے جوان لیکن نحیف جسم پر پڑیں ـــ لنگڑا کچھ بولنے ہی کو تھا۔ اس کے ہاتھ زیبو کی طرف بڑھ کر ہی رہ گئے ـــ زیبو نے سمجھا کوئی فقیر بھیک مانگ رہا ہے اور کڑک کر بولی :ـ

"شرم نہیں آتی اتنی رات گئے گھروں کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے ـــ ہٹے کٹے تو ہو ـــ مل گیا بس بہانہ لنگڑے ہونے کا ـــ بھکاری کے بھیس میں ڈاکہ مارتے پھرتے ہو"۔ زیبو نے زور سے کواڑ بند کر لئے۔

لنگڑے کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے کلیجے پر برف کی قاش رکھ دی ہے ـــ کواڑ کے بند ہونے کی آواز اس کو ایسی معلوم ہوئی جیسے کسی نے مکا سینے پر کھینچ مارا ـــــ زیبو زیبو کی دھیمی دھیمی آواز اس کے ہونٹوں کے بیچ میں دب کر ٹوٹ گئی ـــــ کپکپاتی ہوئی بیساکھی پر لرزتے اور تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے لال لال پتلی پتلی چوڑیاں چوکھٹ پر گریں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئیں۔

درد کے سوکھے ہوئے آنکھوں کے سوتے ابل پڑے ـــ لنگڑا چکرایا، چوکھٹ پر گرا ـــــ پھر اُٹھا اور واپس لوٹ گیا ـــــ نہ جانے کہاں اور کس لئے ؟

اقبال متین

قدیم سنسکرت لٹریچر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مندرجۂ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوگا کہ وَرُن کی خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح دیگر دیوتاؤں سے مال و دولت۔ عیش و آرام کی دعائیں مانگی جاتی ہیں اس دیوتا سے گناہوں کی معافی چاہی جاتی ہے اور عقوبتوں سے محفوظ رہنے کی درخواست بھی کی جاتی ہے۔ غرض کہ سب سے ابتدائی دیوتاؤں میں سے اولاً وَرُن اور اُس کے ساتھ ساتھ وَرُن ہیں۔ لیکن صرف وَرُن ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی دیوتا ہیں جن میں سے ایک مترا ہے۔ یہ دیوتا وَرُن کا ساتھی ہے کیونکہ سوائے ایک بھجن کے جو صرف اُسی سے متعلق ہے باقی ہر بھجن میں جس میں اُس کا ذکر آیا ہے وہ وَرُن کے ساتھ ساتھ مخاطب کیا گیا ہے اور اُس بھجن کا مضمون دونوں سے یکساں متعلق ہے۔ صرف چند ایک بھجن ایسے ہیں جن میں ورن کا نام تنہا آیا ہے۔

اَوِستا میں مِترا کا تلفظ مِتھرا ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جو آجکل کی فارسی میں مِہر ہے بمعنی آفتاب و محبت۔ وہاں یعنی اوستا میں متھرا نور کے دیوتا کا رتبہ رکھتا ہے۔ یہاں یعنی رگوید میں بھی ویسی ہی حیثیت ہے اور بالاجمال وہ دن کی روشنی کا دیوتا ہے اور مترا دوست کو بھی کہتے ہیں۔ ساسانیوں کے ابتدائی زمانہ میں اور اُس کے آس پاس متھرا یا مِہر کی پرستش بڑے زور شور کے ساتھ جاری تھی۔

از روئے رگوید مترا کبھی آفتاب کا مترادف ہے کبھی بالعموم روشنی کا دیوتا ہے اور کبھی (رب النوع یا موکل کے مفہوم کے ساتھ) وہ قوت ہے جو آفتاب پر حکومت کرتی ہے اور مناسب اوقات پر آفتاب کو دنیا کے سامنے چمکاتی ہے۔ اُس کے افعال مرحمت اور مہربانی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ وَرُن کے اوصاف میں وہ برابر کا ساتھی ہے۔ جس طرح آفتاب وَرُن کی آنکھ ہے اُسی طرح مترا کی آنکھ ہے۔ روشنی وہ رتھ ہے جس پر دونوں سوار ہو کر فضا میں اپنے مقررہ راستہ پر رواں ہوتے ہیں۔ اس روشنی کی صفت یہ ہے کہ وہ صبح کے وقت سنہری ہوتی ہے اور غروب آفتاب کے وقت قطبین دھات کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ مترا اور ورن دونوں ریت کے محافظ ہیں اور گناہوں کی سزا و جزا کے مختار ہیں۔ مخصوص طور پر مترا کا کام یہ ہے کہ وہ ہر روز لوگوں کو جگاتا ہے اور اپنے اپنے

کاموں پر اُن کو لگا دیتا ہے۔ اس طور پر وہ آہستہ آہستہ دِن کی روشنی کا دیوتا اور وَرُن رات کی فضائی سماں کا مالک بن جاتا ہے۔ فضا کا رگویدی مفہوم ایک یہ ہے کہ وہ آسمانی دریاؤں کا سمندر ہے، اسی مقام سے وَرُن کا درجہ گھٹنے لگتا ہے۔

اتھروید کے زمانہ میں ایک نئے دیوتا پرجاپتی کی اہمیت قایم ہو جانے سے ورن کی شہنشاہی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ویدوں کے بعد کے زمانہ میں سمندر زمین پر اُتر آتے ہیں اور وَرُن محض ارضی سمندر کا دیوتا رہ جاتا ہے۔ اُس کی فضائی روحانی قوت بھی سلب ہو جاتی ہے اور بجائے عفو کرنے والے دیوتا کے وہ محض سزا دینے والا دیوتا رہ جاتا ہے۔

واضح ہو کہ دَی وس اور وَرُن آسمان سے متعلق ابتدائی دیوتا ہیں۔ قدامت کے لحاظ سے متراؔ کا ذکر اُنکی ذیل میں آگیا ہے ورنہ یہ دیوتا آفتاب سے متعلق ہے۔ آفتاب کے سلسلہ میں اور اُس سے متعلق پانچ دیوتاؤں کا ذکر رگوید میں ہے۔ متراؔ کی کیفیت بیان کی جا چکی ہے جس کی ذات رگوید میں وَرُن میں تقریباً مدغم ہو گئی ہے۔ اُسکے بعد اہم ترین دیوتا سوریہ (سورج) ہے۔ بالعموم اُس کا مفہوم اُس مادی شے سے وابستہ ہے جس کو ہم کرۂ آفتاب کہتے ہیں۔ رگوید میں اُس کو جگہ جگہ آنکھ سے تشبیہ دیگئی ہے۔ وہ صبح کی دیوی کی لائی ہوئی دیوتاؤں کی آنکھ ہے وہ سب چیزیں دیکھتا ہے۔ انسانوں کے اچھے اور برے افعال پر نظر رکھتا ہے اور دنیا بھر کا جاسوس ہے۔ لوگ اس سے بیداری حاصل کر کے اپنے اپنے کاموں اور مشغلوں میں لگ جاتے ہیں۔ وہ ہر شے کی خواہ وہ سکون پذیر ہو یا متحرک روح رواں یا محافظ ہے۔ وہ ایسے رتھ میں چلتا ہے جس میں سات گھوڑے جُتے ہوتے ہیں (عام طور پر رتھ سے مراد صبح لی گئی ہے)۔ "جب وہ اپنے مقام پر پہونچکر اپنے گھوڑوں کو کھول دیتا ہے تو فوراً رات اپنی چادر سب چیزوں پر پھیلا دیتی ہے"۔

"ظلمت کو سورج چمڑہ کی طرح لپیٹ دیتا ہے" اور "ستارے چوروں کی طرح بھاگ جاتے ہیں"۔ وہ "صبح کی گود میں سے چمکتا ہوا نکلتا ہے"۔ رگوید میں بعض مقام پر اُس کو 'صبح کا شوہر' بھی بیان کیا گیا ہے۔ استعارہ کے طور پر اکثر مقامات پر سورج کا ذکر 'پرند' اور "عقاب" کے ناموں سے کیا گیا ہے جو فضا میں منازل طے کر رہے ہیں۔ اُس کا ذکر اس طرح سے بھی آیا ہے کہ وہ ایام کی پیمایش کرتا ہے اور زندگی بڑھاتا ہے۔ وہ بدخوابی اور بیماریوں کو بھی بھگا دیتا ہے۔ طلوع کے وقت اُس سے یہ التجا بھی کی جاتی ہے کہ وَرُن اور متراؔ کے دربار میں لوگوں کی بے گناہی کا اعلان کرے۔ سب ہستیوں کا حصر سورج پر ہے اس لئے اُس کو خالقِ کل کے الفاظ سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ یہ ہے خلاصہ اُس ثنا و صفت کا جو رگوید میں سوریہ دیوتا کی کی گئی ہے۔

آفتاب سے متعلق تیسرا دیوتا سَوِتر ہے۔ اُس کی توصیف میں گیارہ یا اُسی قدر بھجن ہیں جتنے سوریہ

کے متعلق۔ باعتبارِ لغت یہ تازگی اور زندگی کا دیوتا ہے اور بہ لحاظِ دیگر وہ آفتاب کی اُس طاقت یا خاصیت کا نمایندہ ہے جو اشیاء میں جوششِ زندگی و تازگی پیدا کرتی ہے۔ اُس کا رنگ طلائی ہے اور اُس کے دست و ساعد اور اُس کی سواری کا رتھ سب کندنی ہیں۔ وہ اپنے مضبوط طلائی ہاتھ اُٹھا کر سب کو برکت پہونچاتا ہے اور بیدار کرتا ہے اور اُس کے ہاتھ زمین کے کناروں تک پھیل جاتے ہیں۔ وہ اپنے طلائی رتھ میں بیٹھ کر ساری مخلوقات کو دیکھتا ہوا بالاؤ پست راستہ پر رواں ہوتا ہے۔ صبح کے راستہ پر اُس کے عقب میں چمکتا ہوا نکلتا ہے۔ آفتاب کی شعاعوں سے منور ہو کر سنہری زلفوں والا سوِتر علی التواتر مشرق کی سمت سے اپنا نور پھیلاتا ہے۔ شیاطین اور ساحروں کو بھگا دیتا ہے اور بُرے خوابوں کو دفع کرتا ہے۔ انسان کی زندگی کو دراز کرتا ہے اور دیوتاؤں کو بقا عنایت کرتا ہے۔ مُردوں کی روحوں کو وہ اُس جگہ لے جاتا ہے جہاں نیک کردار رہتے ہیں۔ جتنے دیوتا ہیں اُن سب کی رہبری کرتا ہے۔ کوئی دیوتا خواہ وہ اندر یا ورن جیسا طاقتور دیوتا ہی کیوں نہ ہو اُس کی آزاد حکومت اور مرضی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شام سے اُس کا گہرا تعلق ہے اور ایک بھجن میں اُس کو غروب ہونے والے آفتاب کی شان میں سراہا گیا ہے۔ اسی دیوتا کی مدح سرائی کے سلسلہ میں وہ مشہور بند ہے جس کو رگوید کی جان سمجھا جاتا ہے اُسی طرح جس طرح بسم اللہ کو قرآن کا خلاصہ کہا جاتا ہے۔ دیوتا کے نام پر اس بند کو ساوِتری کہتے ہیں۔ اُس کا دوسرا نام گایتری بھی ہے کیونکہ جس بحر میں وہ بند لکھا گیا ہے وہ گایتری ہے۔ عام طور پر وہ اسی نام سے موسوم ہے۔ اس کا ترجمہ پیش ہے (منڈل ۳۔ سوکت ۶۲۔ بند ۱۰)۔

May we attain that Excellent
Glory of savitri the God
That we may Stimulate our thoughts

(آرزو یا دعا ہے کہ) ہم کو سوِتر دیوتا کی وہ ارفع و اعلےٰ فروشان حاصل ہو تاکہ وہ (دیوتا) ہمارے خیالات میں تحریک پیدا کرے۔"

صبح و شام عبادت کے وقت ہر ہندو آج تک اس منتر کا ورد کرتا ہے۔ جس طرح نماز میں سورۂ الحمد عبادت کا جزو لازمی ہے اُسی طرح یہ بھی ہے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی دعا ہے کہ سوِتر دیوتا ہم کو ہماری عبادات یا خیالات میں توفیق و تحریک عطا کرے۔ اس کے اس قدر تقدس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ابتدا سے آج تک یہ دعا عبادت کا جزو لاینفک مانی جاتی ہے۔ کتاب ویدک انڈیا، کے مصنف مسٹر ریگوزن نے اس کے متعلق اپنی ایک رائے ظاہر کی ہے جو یہاں قابلِ ذکر ہے۔ قدیم زمانہ کے رشیوں میں سے یا یوں کہئے کہ رگوید کے بھجنوں کے مصنفین میں سے دو مشہور رشی وشسٹھ اور وِشوامتر ہیں۔ یہ منتر وشوامتر کی تصنیف ہے اور ظاہر ہے کہ آسمانی فضا کے نور یعنی

آفتاب کی پرستش سے متعلق ہے۔ آفتاب ایک کرۂ نار ہے جس کا مظہر زمین پر آگ ہے۔ بہ الفاظِ دیگر آفتاب کی پرستش ریک بدلی ہوئی یا برتر شکل آتش پرستی کی ہے جس عبادت کے وقت اس منتر کا ورد ہوتا ہے وہ عبادت یہی ہے کہ آگ روشن کی جاتی ہے اور اُس پر گھی نذر کے طور پر جلایا جاتا ہے۔ پہلے سوم رس بھی چڑھایا جاتا تھا لیکن آج کل خوشبویات اور پھول وغیرہ نذر کئے جاتے ہیں۔ یہ تھا قدیم آریوں کا مذہب اور عقیدہ۔ جب ہندوستان میں اُن کا سابقہ ایسے مقامی لوگوں سے پڑا جن کے عقاید بالجملہ سفلی تھے (مثلاً مادر زمین کو سانپ کی شکل میں پوجنا) تو ایک بہت اہم اور دقت طلب کشمکش پیدا ہوگئی۔ سوال یہ تھا کہ باہر سے آئے ہوئے آریہ مقامی لوگوں سے کس حد تک گھل مل سکتے ہیں۔ اس مضمون کے ماسبق حصہ میں اس قدر تشریح آچکی ہے کہ اپنی روایات وعقاید ورسوم کو محفوظ کرنے کے لئے آریہ اقوام نے کیا کیا فکریں کیں۔ اور مفتوحہ اقوام کو الگ تھلگ رکھنے کے لئے کیا کیا انتظام کئے لیکن اُسی کے ساتھ ایسی قوتیں بھی کارفرما تھیں جو دونوں قوموں کو اتصال والحاق کی طرف لیجا رہی تھیں چنانچہ اسی آریہ گروہ میں ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو اتحاد کا حامی تھا۔ اس طرح آریہ فرقوں میں دو گروہ ہوگئے۔ ایک الگ تھلگ رہنے کا حامی تھا اور دوسرا میل جول کا گرویدہ۔ وشسٹھ پہلے گروہ کا اور وِشوامتر دوسرے گروہ کا سردار تھا۔ یہی وِشوامتر تھا جس نے تبدیل مذہب کا اُصول قایم کیا وِشوامتر کے معنی ہیں 'سب کا دوست'۔ اگر درحقیقت اس نام کا کوئی تھا (نوٹ:۔ رشیوں کے متعلق یہ امر متحقق نہیں ہے کہ اُن ناموں کے اشخاص کوئی حقیقی وجود رکھتے تھے) تو وہ یہ شخص ہے جس نے تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور آریہ مذہب میں لانے کے لئے ہندوستان میں جابجا مشنری بھیجنے کی ترغیب دی۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی مقامی غیر قومی راجاؤں کا پُروہت بن گیا۔ وشسٹھ کے پیرو وِشوامتر کو اور اُس کے خیالات کو بُرا سمجھتے تھے لیکن تاریخی واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ وشوامتر اور اُس کے پیروؤں نے جو عمل جاری کیا وہی کامیاب رہا۔ یہ اُسی کامیابی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں چاروں طرف آریہ مذہب دیسی مذہبوں سے مخلوط ہو کر پھیل گیا جس کو ہندو مذہب کہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک نئی مخلوط قوم بھی بن گئی جس کو آج کل مجموعی طور پر ہندو قوم کہتے ہیں۔ آریہ مذہب کا برترین علوی عقیدہ آتش پرستی اور آفتاب پرستی سے متعلق تھا۔ دیسی گروہوں اور فرقوں کو آریہ مذہب میں لانے کے لئے وتبدیل مذہب کے لئے اِس عقیدہ کی تلقین ضروری اور کافی تھی۔ چنانچہ جس طرح مسلمانوں میں کلمۂ توحید مسلمان بنانے کا ذریعہ ہے اُسی طرح زیر بحث منتر سے کام لیا جانا قیاس کیا جاتا ہے۔ اس طور پر اس منتر کا ہندو عقائد کا جزو لاینفک ہوجانا بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے ورنہ دیگر نہج پر یہ معمّا ہی رہتا ہے۔

ترا۔ سُوریہ۔ سُوتر کے علاوہ آفتاب سے متعلق باقی ماندہ دو دیوتا پُشن اور وِشنو ہیں۔ پُشن آفتاب کی اُس رب رحمانی کا مترادف ہے جو خصوصیت کے ساتھ مرغزاروں سے متعلق ہے۔ بالاجمال وہ مرغزاری اور زراعتی دیوتا

ہے۔ لغوی معنی میں وہ فلاح و بہبودی عطا کرنے والی شخصیت ہے۔ وہ ایسی گاڑی میں سوار ہوتا ہے جسکو بکرے کھینچتے ہیں اور اُس کے ہاتھوں میں آنکس بھی رہتا ہے وہ آسمان کے راستوں سے بخوبی واقف ہے اور مردوں کو اُن کے آباؤ اجداد کے پاس پہونچا دیتا ہے۔ وہ ارضی راستوں کا محافظ ہے۔ اور مویشی کو اپنے آنکس سے رہنمائی کرتا ہوا اُن کی حفاظت کرتا ہے۔ اُس کی مرحمت اُس کی اُس حفاظت اور رہنمائی کا نتیجہ ہے جو وہ انسانوں اور مویشی پر برسر زمین قایم رکھتا ہے اور جس کے ذریعہ سے انسانوں کو دوسرے عالم میں راحت کے مقامات پر پہونچاتا ہے۔ وہ ہر قسم کے مال و اسباب کی حفاظت کرتا ہے۔ گمشدہ چیزوں کو پیدا کر دیتا ہے اور پوشیدہ خزانوں کا جن میں سب سے پہلی چیز گائے ہے پتہ بتا دیتا ہے۔ اُس کا لقب راستوں کا مالک ہے۔ وہ انسان اور حیوان کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہی سَوم کو پردۂ خفا سے آوارہ شدہ بیل کی طرح پکڑ لایا۔ پُشن نے ہی "اُس بادشاہ کو ڈھونڈھ نکالا جو متبرک گھاس پر اپنا نور چمکاتا ہے۔" وہ شعاعوں سے بھرا ہوا ہے اور دوشیزۂ شمس کا عاشق دلدادہ ہے۔

رگوید کے زمانہ میں وشنو چوتھے درجہ کا دیوتا ہے، لیکن تاریخی حیثیت سے یہ اہم ترین دیوتا ہے۔ آج کل ہندو مذہب میں کارفرما صرف دو دیوتا شِو اور وِشنو ہیں۔ یہ وِشنو وہی رگوید کا وشنو ہے جو بعد کے زمانہ میں ترقی کے درجات طے کرتا ہوا اس آخری منزل پر پہونچا ہے۔ رگویدی وشنو عین آفتاب تو نہیں لیکن اُس سریع الرفتار کرۂ منور کی شخصیت ہے جو ہر سہ عالم یعنی عالم ارضی۔ عالم ہوائی اور عالم آسمانی کو تیز گامی کے ساتھ طے کرتا ہے وہ انسان کے فایدے کی غرض سے تین قدم چلتا ہے اور اُس کا آخری اور بالاترین قدم آسمان پر ٹھہرتا ہے۔ جہاں دیوتا اور گزرے ہوئے آباؤ اجداد رہتے ہیں۔ اُس کی منفعت رسانی براہمنڑوں کے زمانہ میں اور ویدی زمانہ کے بعد کے زمانوں میں دلچسپ روایات اور خیالات کا باعث ہوئی۔ براہمنڑوں میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ کسی زمانہ میں عالم ارضی پر عفریت صفت خبیث شخصیتیں قابض و متصرف ہو گئی تھیں۔ اُن کا شر رفع کرنے کے لئے وشنو زمین پر ایک کوتاہ قد بونے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ پست قامتی کی وجہ سے بظاہر یہ امر محال معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساری زمین کو اپنی تیز گامی سے طے کرلے لیکن وشنو نے اپنی تیز گامی سے میدان جیت لیا اسی روایت سے آگے چل کر مختلف اوقات میں وشنو کے آسمان سے زمین پر اُترنے کی اور بہت سی روایتیں پیدا ہو گئیں اور ساتھ ہی ساتھ خدا کے انسانی اور حیوانی قالبوں میں نمودار ہونے اور اوتاروں کے ظہور کے مسئلہ کی ترویج ہو گئی۔ رگوید کے دیوتاؤں میں یہ ایک معمولی دیوتا ہے اور بالعموم اِندر کا ساتھی اور دوست ہے جب اِندر اپنے دشمن وِرِتر کو ہلاک کرتا ہے تو وِشنو اُس اصطبل کا دروازہ کھول دیتا ہے جس میں گائیں مقید ہیں۔ اُس کے تین قدموں کی تاویل اس طرح کی گئی ہے کہ اُس سے کرۂ زمین۔ آسمان اور زمین و آسمان کی درمیانی

فضا۔ روشن ہیں۔ یوں بھی قیاس کیا گیا ہے کہ اُن سے مراد صبح اور دوپہر اور شام کے اوقات ہیں۔ رگوید کے ایک منتر کے حوالہ سے ایک توضیح اس طرح کی جاتی ہے کہ پہلے اور دوسرے قدم سے مراد ارض و سما ہیں اور تیسرا قدم وہ مقام اعلیٰ علیین ہے جہاں فہم و علم انسانی کی رسائی نہیں۔

تجلیات کی ذیل میں صبح (فلق) بھی آتی ہے۔ رِگوید میں صبح کی دیوی کا نام اُشس ہے اور وہ رگویدی زمانہ کی عزیز ترین دیوی ہے۔ دیویاں اور بھی ہیں لیکن اُشس ایسی دیوی ہے جس کی ثنا و صفت سب سے زیادہ کی گئی ہے اور پورے پورے بھجن اُس کی توصیف میں تصنیف کئے گئے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ متعدد بھجنوں میں اُس کا ذکر آیا ہے۔ مخصوص طور پر بیس بھجنوں میں صرف اُسی کو مخاطب کر کے سراہا گیا ہے اور چونکہ اُس کی پوجا میں پیچیدگیاں کم تھیں مثلاً سوم رس وغیرہ نہیں چڑھایا جاتا تھا اس لئے بھجنوں کا مضمون پوجا کی تفصیل سے پاک و صاف رہا اور شاعرانہ تخئیل سہانے اسلوب سے کارفرما رہی۔ ایک محقق نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بہ اعتبار نفاستِ مضمون اُشس دیوی رِگوید کی سب سے زیادہ محبوب مخلوق ہے۔ اور دنیا بھر کی مذہبی لٹریچر میں سب سے پیاری تصویر ہے۔ رِگوید کے شاعروں کے نزدیک وہ کیا ہے ملاحظہ ہو:۔

۱۔ اُشس ایک درخشاں دوشیزہ ہے جو آسمان میں پیدا ہوئی ہے اور دیئوس کی لڑکی ہے۔

۲۔ وہ اندھیری رات کی رخشندہ بہن ہے۔

۳۔ وہ اپنے عاشق کے نور سے یعنی سوریہ کی نور سے درخشاں ہوتی ہے۔ سوریہ اُس کے راستہ پر پیچھے سے شعاعیں چمکاتا ہے اور اس طور سے اُس کا تعاقب کرتا ہے جیسے کوئی نوجوان کسی دوشیزہ کا۔

۴۔ وہ ایسے منور رتھ پر سوار ہو کر نکلتی ہے جس کو لال گائیں اور گھوڑے کھینچتے ہیں۔

۵۔ کسی رقاصہ کی طرح وہ شوخ لباس پہنکر اپنے سینے کا اُبھار دکھلاتی ہے۔

۶۔ وہ ایسی دوشیزہ ہے جو نور کی پوشاک سے آراستہ ہو کر مشرق میں رونما ہوتی ہے اور اپنی بہار حُسن کو بے نقاب کرتی ہے۔

۷۔ لاجواب حُسن سے متجلی ہو کر وہ اپنے نور سے چھوٹے بڑے کسی کو محروم نہیں کرتی۔

۸۔ وہ آسمان کے دروازے کھول دیتی ہے اور خانۂ ظلمت کے در کشادہ کر دیتی ہے۔

۹۔ اُس کی روشن شعاعیں مویشی کے گلّوں کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۰۔ وہ رات کی کالی پوشاک کو اُتار کر ارواحِ خبیثہ اور نفرت خیز تاریکی کو دفع کرتی ہے۔

۱۱۔ وہ پیروں والی نباتات کو جگاتی ہے اور پرندوں کو اُڑاتی ہے۔ اور وہ ہر شے کی جان ہے۔

۱۲۔ جب اُشس چمکتی ہے پرند اپنے گھونسلوں سے اُڑ جاتے ہیں اور انسان اپنی روزی تلاش کرتے ہیں۔

۱۳- وہ شیریں اصوات کی رخشندہ محرک ہے اور سُریلی آوازوں کی بہار کی سردار ہے۔
۱۴- وہ دیوتاؤں کے حکم اور ریت کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتی اور ہمیشہ روز بروز وقتِ مقررہ پر ظاہر ہوتی ہے۔
۱۵- وہ اپنی ریت کا راستہ جانتی پہچانتی ہے اور کبھی اپنی راہ نہیں بھولتی۔
۱۶- جس طرح اگلے زمانہ میں وہ چمکتی تھی اب بھی چمکتی ہے اور آیندہ بھی نور پھیلاتی رہے گی۔ وہ لافانی ہے اور کبھی بوڑھی نہ ہوگی۔

خلاصہ مندرجۂ بالا ترجمہ ہے رگوید کے شاعروں کی اُن الفاظ اور تشبیہات کا جن میں اُشس دیوی کی ثناؤ صفت کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں کچھ حصۂ مضمون ایسے خیالات سے بھی متعلق ہے جن کا تصور صبح کی خاموش فضا میں کم و بیش ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ انسانی زندگی اور انسانی کاروبار کی عارضی کیفیت ایسے اوقات میں اکثر پیش نظر آجاتی ہے اور صبح کا تواتر اور دوام اس قسم کے خیالات کو اور بھی اُبھار دیتا ہے چنانچہ رگوید کے پہلے منڈل کے ایکسوتیرھویں بھجن کے گیارھویں منتر کا ترجمہ تمثیلاً پیش ہے:-

"گئے گزرے ہوئے وہ فانی انسان جو اگلے زمانہ میں ـــــ اولین صبح کے جلوہ کا انتظار کرتے تھے۔ اس وقت ہم جو بہ قید حیات ہیں اُس کی چمک دمک دیکھ رہے ہیں ـــــ وہ لوگ بھی آنے والے ہیں جو آیندہ زمانہ میں اُس کو دیکھا کریں گے۔"

غرضکہ اُشس دیوی ایک دلفریب حسینہ ہے جو اپنے حُسن کی بہاریں دکھا کر دنیا کو لبھاتی رہتی ہے وہ ضیا بخش و عطا پاش ہے۔ وہ رات کی لڑکی بھی ہے اور بہن بھی۔ وہ کبھی سُوریہ کی بہن ہے کبھی معشوق اور کبھی ماں۔ کبھی وہ گائے ہے کبھی گائے کی بچھیا اور کبھی سنہرے بچھڑے آفتاب کی ماں۔ اُس سے مال و دولت کی دعائیں کی جاتی ہیں۔ اُس کے مایۂ دولت اور عطا پاش ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ وہ لوگوں کو بیدار کر کے روزی کمانے کے دھندوں میں لگا دیتی ہے۔ ہر گھر میں متبرک آگ روشن کراتی ہے اور پوجاریوں اور بھاٹوں کے لئے انعام اور دان کا سامان مہیا کرتی ہے۔ اور پوجا کرانے والے ججمان راجوں اور رئیسوں کے لئے فراہمی دولت کی دعائیں منگواتی ہے۔ باوجود ایں ہمہ اُشس دیوی پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اندر دیوتا اُس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اُس کو، اُس کے رتھ کو اور اُس کے حُسن کو غیظ و غضب کے ساتھ برباد کر دیتا ہے۔ تصور شرط ہے کہ یہ وہ وقت ہونا چاہئے جب برسات کے موسم میں آسمان تانبا ہو کر رہ جاتا ہے اور صبح کی تابش نمونۂ دوزخ بن جاتی ہے۔ اِس حالت میں سوم رس سے سرمست اندر دیوتا ہی کی وہ شخصیت ہے جو اپنے طوفانی حملوں سے اُشس دیوی کے رنگ روپ کو خاک میں ملا سکتی ہے یعنی ایام کی سوزش کو بادلوں کے سایہ میں بارش کی ٹھنڈک سے کافور کر سکتی ہے۔

اُشس کی طرح رگوید کے دو محبوب دیوتا اَشوین نام کے ہیں۔ یہ دونوں توام بھائی ہیں اور آسمانی روشنی کے سلسلہ کی آخری کڑیاں ہیں۔ لغوی معنی گھوڑے والے۔ رگوید میں چونکہ وہ گھوڑوں پر سوار نہیں دکھائے گئے ہیں اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ وجہ تسمیہ گھوڑے، یعنی آفتاب یا آسمان کی اولاد ہونیکا مفہوم ہو۔ بہرحال ان کی بھی بہت سے بھجنوں میں اُن کا تذکرہ آیا ہے۔ ثنا و صفت کے علاوہ اُن سے بہت سے افسانے بھی متعلق ہیں۔ یہ امر بہت زیر بحث رہا ہے کہ یہ کیا شے ہیں یا کس شے کا مظاہرہ ہیں۔ بالآخر رگوید کی عبارت اور اُس کی تخیل کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ وہ اُس سماں کی نمایندگی کرتے ہیں جو صبح کے وقت پو پھٹنے سے پیشتر رات کی ظلمت کو ختم کرتا ہے اور صبح کے آغاز ہونے کا پیغام لاتا ہے۔ یعنی صبح کاذب کا وقت۔ رگوید کے ابتدائی حصہ میں اُن کا اسی قدر مفہوم پایا جاتا ہے اور اس اعتبار سے یہ دونوں بھائی صبح کاذب کے دوسرے یعنی صبح کاذب کے لمحات اولین و آخرین ہیں۔ لمحۂ اول میں کچھ اندھیرا ہی رہتا ہے اور لمحہ آخر کے بعد روشنی ظاہر ہونے والی ہی ہوتی ہے۔ رگوید کے پچھلے زمانہ میں اس مفہوم میں پہلے یہ تبدیلی ہوئی کہ صبح کاذب کے علاوہ شام کا وہ سماں بھی جب دونوں وقت ملتے ہیں (یعنی وہ ہلکی روشنی کا سماں جس کا شمار نہ دن میں ہوتا ہے نہ شام میں) اُس میں شامل ہو گیا یعنی ایک بھائی سے صبح کاذب متعلق ہو گئی اور دوسرے بھائی سے شام کا دھندلکا۔ اور اُنکی پرستش کا صبح و شام آغاز ہوا۔ رگوید کے آخری زمانہ میں پھر ایک تبدیلی ہوئی اور دوپہر کے وقت بھی اُنکی پوجا کا سلسلہ جاری ہوا۔

(باقی)

ا - ح

حساب بیباق

ایک جوان لفٹننٹ کو ترقی دیکر کپتان بنایا گیا لیکن پروانہ میں ترقی کی تاریخ ۱۹۴۱ء کی جگہ ۱۰۴۱ء درج ہو گئی۔ اس کے ساتھیوں نے اسے سمجھایا کہ تم ۱۰۴۱ء سے اس وقت تک کا مطالبہ کرو، یہ راضی ہو گیا اور اس نے باضابطہ درخواست دیدی۔

ایک ہفتہ کے بعد فوج کے دفتر سے جواب ملا کہ تمھارا مطالبہ درست ہے اور ۹۹۹۹ پونڈ تم کو ملنا چاہئے، لیکن فوج کا قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی لڑائی میں کمانڈر کی غفلت سے کوئی نقصان ہو جائے تو وہی اس کا ذمہ دار ہوگا، پھر چونکہ تمھاری درخواست سے ثابت ہوتا ہے کہ تم ۱۰۶۶ء کی لڑائی (Battle of Hastings) میں کمانڈر تھے اور اس میں ۲۰ ہزار گھوڑے تمھاری غفلت سے ضایع ہوئے جن کی قیمت ۴۰ ہزار پونڈ ہوتی ہے، اس لئے تمھارا مطالبہ اس حساب میں ضبط کر لیا گیا اور ایک پونڈ تمھارے ذمہ اور باقی رہا اس لئے اسے فوراً ادا کرو۔

ماجد ولین کا ایک صفحہ

پچھلے مہینے ہم نے ماجد ولین کے ہیرو کا ایک خط پیش کیا تھا جو اس نے اپنی محبوبہ کے نام لکھا تھا۔ اس اشاعت میں اسی ناکام محبت کا دوسرا خط ملاحظہ ہو:۔

اب مجھے شاید ہی کسی چیز پر رحم آتا ہو ——— دُنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہے اور کائنات ایک ویران وحشت کدہ ! میری زندگی، ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا ایک مسلسل رات ہے، جس کی صبح شاید کبھی نہ ہوگی ——— لوگ اپنی اپنی خوابگاہوں میں محوِ خواب ہیں اور میں ——— مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے ——— گویا دنیا سے بہت دور کسی بے آب و گیاہ صحرا میں پڑا ہوا ہوں جہاں نہ دریا بہتے ہیں، نہ پرندے چہچہاتے ہیں، نہ کسی انسان کا گزر ہے، نہ حیوان کا ——— اور ——— میں رات دن اس صحرا میں حیران و سرگرداں پھر رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ یہاں سے نکل جاؤں، لیکن نہیں نکل سکتا۔

اے ماجد ولین، تمھیں بتاؤ مجھے موت کب آئے گی اور میرا وقت کب پورا ہوگا کہ زندگی کے ان مصائب و آلام سے چھوٹ جاؤں۔

اے ماجد ولین، تم سے چھٹ کر میں کسی طرح صبر پر قادر نہیں ہوں، کیونکہ تمھیں اس دنیا میں میرے لئے سب کچھ ہو ——— میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے اپنی تمام دولت جُوئے میں ہار دی ہو اور احساس بیچارگی کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ ہو۔

آہ ——— میرے دل میں کیا کیا تمنائیں تھیں، کیسی کیسی آرزوئیں تھیں، میرا سینہ کن کن ارادوں سے معمور تھا اور میں اپنے اندر وہ قوت محسوس کرتا تھا کہ دنیا کی بڑی سی بڑی چیز بھی بے حقیقت نظر آتی تھی، لیکن آج میں کس قدر کمزور، کتنا افسردہ و مجروح ہوں کہ نہ کچھ سوچ سکتا ہوں، نہ سمجھ سکتا ہوں، گویا ایک پتھر ہوں جو راہ میں صرف ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اے ماجد ولین، کیا تم اس دن سے نہیں ڈرتیں جب خدا تم سے پوچھے گا کہ تم نے ایک بے گناہ انسان کو کیوں قتل کیا اور جب میری آواز (تم جہاں بھی ہو) تمھارا پیچھا کرے گی تمھاری خلوتوں اور جلوتوں میں

سوتے جاگتے ہیں، تمہارے شوہر کی آغوش اور تمہارے بچوں کے گہواروں میں!

اے ماجدولین، کیا تم نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تم میری اسی طرح پاسبانی کروگی جس طرح فرشتے انسان کی حفاظت کیا کرتے ہیں ـــــ پھر اب کہ میں دُنیا میں سب سے زیادہ بدنصیب ہوں، تمہارے وہ تمام وعدے کیا ہوئے؟

ذرا تو میرے پاس آؤ، کچھ دیر تو میرے پاس ٹھہرو تاکہ میں تمہیں نگاہ بھر کر دیکھ سکوں اور تمہاری عرق آلود پیشانی میں اپنی مٹی ہوئی تمناؤں کی تصویر اور برباد شدہ امیدوں کا عکس دیکھ سکوں ـــــ آؤ ـــــ اور مجھے اپنی وہ شیریں آواز سنادو جو اس سے پہلے کبھی سنایا کرتی تھیں اور اپنی ان محبت بھری نگاہوں میں سے صرف ایک نگاہ مجھے دیکھ لو جن سے تم مجھے حیات تازہ بخشا کرتی تھیں ـــــ اور ـــــ جھوٹ یا سچ بس اتنا کہدو کہ تم مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہو ـــــ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔

اے ماجدولین، سچ کہتا ہوں، اگر میں کبھی تمہیں اپنے راستہ میں دیکھ لوں تو تمہاری طرف دوڑ پڑوں اور تمہارے قدموں پر اپنا سر رکھ کر بھکاری کی طرح تم سے محبت کی بھیک مانگوں اور اگر تم مجھے دیکھ کر منھ پھیر لو تو تمہارے پیچھے پیچھے پھروں جب تک کہ تم میری طرف متوجہ نہ ہو جاؤ اور میرا دردِ دل نہ سُن لو۔

اے ماجدولین، میں سخت تکلیف میں ہوں اور میرا خیال ہے کہ جو درد و دُکھ میں برداشت کر رہا ہوں وہ اس دنیا میں کوئی نہیں اُٹھا سکتا ـــــ خدا کے لئے، ماجدولین، مجھ پر رحم کرو اور اگر تم مجھے اپنی محبت کے قابل نہیں سمجھتی ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو اور یہ بھی اگر منظور نہ ہو تو پھر مجھے اجازت دو کہ تم جہاں بھی جاؤ، میں تمہارے ساتھ ساتھ رہوں، جس طرح تمہارا کتا ـــــ تمہارے ساتھ رہتا ہے تاکہ میں تمہیں ہر وقت دیکھتا رہوں، تمہاری آواز سنتا رہوں، کیونکہ اس دنیا میں تم سے جدا رہ کر میں کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا۔

نوٹ: آئندہ جنوری ۱۹۴۷ء کے "نگار" میں یہ داستان پوری کی پوری شایع کی جائے گی

اور

ن حضرات کا چندہ دسمبر ۱۹۴۶ء میں ختم ہوتا ہے ان کے نام بجائے پانچ روپیہ چار آنہ کے چھ روپیہ ر آنہ کا وی۔ پی جائے گا، لیکن جن کا چندہ ختم نہیں ہوا ہے ان کو ایک روپیہ چار آنے کا ں پی بھیجا جائے گا ـــ پیشگی رقم بھیجنے میں آپ کو چار آنہ کی بچت ہے ـــ یہ نگار کے چندہ میں کوئی مقل اضافہ نہیں ہے، بلکہ صرف ماجدولین کی وجہ سے ایک روپیہ زاید طلب کیا جاتا ہے۔

شور (علیگ)

آدمی اگر مہذب وجدان اور صحت مند جمالیاتی شعور رکھتا ہو تو ادب کی تمام وسعتیں اپنی ادبی سماجی اور لسانی خوبیوں کے باوجود صرف ایک اشارہ ایک آہنگ ایک آواز ایک لب ولہجہ کا نام ہے جو کسی اور سہارے کا محتاج نہ ہو، اور انسان کے خیالات اور جذبات میں ایک ربط پیدا کر جائے، خیالات و جذبات کا ایسا اظہار صرف ادب ہی کے ذریعے سے نہیں ہوتا، مصوری، موسیقی، فنونِ لطیفہ بھی ایسی کاوش میں پیش پیش رہے ہیں، مگر جب بات الفاظ تک محدود ہو، اور یہ الفاظ سیاسی دستاویز کی حیثیت نہ رکھتے ہوں تو ادب پیدا ہوتا ہے، ایسے ادب میں جو بات سب سے زیادہ اُجاگر ہوتی ہے، وہ ایک خاص شخصیت اور ایک خاص وجدان کی ترجمانی ہے، اگر ہم الفاظ کا پردہ اُٹھا دیں اور آواز جس سمت سے آرہی اُدھر بڑھیں اور ہمیں کوئی جیتا جاگتا انسان نہ مل سکے، تو ایسی شاعری چاندنی چوک کے فقیروں کی آواز سے زیادہ معنی نہیں رکھتی، شعر و ادب میں شخصیت کا وجود ہی سب کچھ ہے، ایک شعور کی تلاش کے بعد اُن الفاظ کے معنی جو ایک خیال کے اظہار کے لئے استعمال ہوتے ہیں، کچھ اور ہو جاتے ہیں، جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ ایک خاص آدمی کو ہم سے کچھ کہنا سُننا بھی ہے، تو ہمارا سارا دھیان بلا ارادہ اُس کی طرف ہو جاتا ہے، کہنے والے میں اگر صلاحیت ہے تو اُس کا انداز کبھی کسی محبوبِ جاں نواز کی طرح کھویا کھویا سا کبھی کسی ہمراز کی طرح سرگوشیاں کرتا ہوا کبھی رندِ بلانوش کی طرح بیباک اور کھلا ہوا بھی ہوتا ہے، مگر ان مختلف صورتوں کو ایک کُل کے لباس میں ظاہر ہونا چاہئے، یہ صدائیں ایک ارغنوں کے مختلف سُروں کی طرح ایک ہی راگ میں گھلی ملی ہوں اور یہ اُس وقت ممکن ہے، جب کہنے والے کی شخصیت مکمل اور واضح ہو، جب ہر تجربہ ہر احساس ہر لفظ ایک خاص شعور سے گزر کر انفرادیت کا حامل ہو جائے، ایسی انفرادیت کا جو خود پسندی اور نفرت سے دور اپنی انانیت کے زور میں صرف کلغی لگا کر چلنے کی ہوس نہ رکھتی ہو، اُن تصورات کا جو ادب میں جگہ پاتے ہیں اور اُن الفاظ کو جو تصورات کا جامہ ہوتے ہیں، ایک خاص شخص کی انفرادیت سے ایسا ہی تعلق ہے جیسے شعلہ کا آگ سے، یہ بات نہیں ہے کہ ایسے تصورات اور خیالات دوسروں کے نہیں ہو سکتے، بلکہ دیکھنا یہ چاہئے کہ یہ تصورات اُس کے کتنے اپنے ہوتے ہیں جیسے اُس کی نشست و برخاست کے طریقے اُس کی گفتگو اُس کی

روزانہ زندگی گویا اس طرح ادب خارجی نہیں سرتاسر داخلی چیز ہے، کم سے کم اظہار کے طریقوں میں، ادب اشیا کی تعریف کا نام نہیں ہے، اُن کے وجود کے احساس سے خیالات کے اظہار کا نام ہے، اس بات کو آسانی سے سمجھنے کے لئے ہم سائنس میں لفظ و خیال کے استعمال پر غور کریں گے، سائنس میں لفظ کا استعمال اشیاء کی تعریف میں ہوتا ہے، کیسا ہے ؟ کہاں ہے ؟ کا ہیکے لئے مشہور ہے ؟ اس کا جواب سائنس سے زیادہ مکمل کوئی نہیں دے سکتا، مگر ایسا جواب ایک نشان ہوتا ہے، ایک علامت ہوتی ہے زبان نہیں ہوتی، ادب نہیں ہوتا، جو چیز اقلیدس کے نظریات کو بہت سُلجھے ہوئے انداز میں سمجھا سکے، وہ الفاظ کا سلسلہ تو ضرور ہے، مگر ادب نہیں، اُس کا رشتہ کائنات اور کائنات کی حقیقتوں سے صرف اتنا ہے، کہ وہ ایک یادداشت کی طرح اشیاء کی ایک چھوٹی سی فہرست ہو کر رہ جائے، وہ اُن اشیاء کے وجود سے پیدا ہونے والی کیفیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، سائنس کی طرح مذہب، اخلاقیات اور فلسفہ میں بھی الفاظ کا استعمال ایک علامت کی طرح ہوتا ہے، وجدان کے ترجمان کی حیثیت سے نہیں، اسی لئے جہاں دنیا کے اور علوم کائناتی ہیں، شاعری یا ادب اپنے اپنے ذوق کی چیز ہو کر رہ گئے، یہاں شخصیت کے سوا کسی اور کا گزر نہیں ادب میں الفاظ کا استعمال اُس کی پوری معنویت کے ساتھ ہوتا ہے، وہاں ایک محاورہ، ایک اشارہ، ایک طرزِ نگارش، ایک لَے، ایک مکمل تاریخی شعور کی اہمیت رکھتے ہیں، پروفیسر آئنسٹائن کے تصورات اضافی کو اگر علمی ریاضی کے ہندسوں میں بھی سمجھایا جائے تو اُس نظریہ میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ مگر یہی بات شیکسپیئر کے شعر کے ساتھ ادب کے نظامِ شمسی کو ڈانواڈول کر کے رکھدے گی، الفاظ اور خیالات کا اتنا صحیح امتزاج کہ ایک طرف تو وہ وجدان کے ترجمان ہوں، اور دوسری طرف ایک تاریخی شعور کو اُجاگر کر جائیں، ہر ایک کے بس کا روگ نہیں، اس سلسلہ میں مجھے اس وقت شور کا ذکر کرنا ہے، جن کی سنبھلی ہوئی آواز موجودہ دور میں خاص وزن رکھتی ہے۔

شور کے سوچنے سمجھنے اور بات کہنے کے انداز سے ایک خاص شخص کا شعور جھلکتا ہے، اور اس میں شائستگی دوسروں سے زیادہ اس لئے ہے، کہ اس میں جو وجدان اور ذہنِ گرم کار ہے، وہ علی گڑھ کی فضا کا پروردہ ہے، علی گڑھ اب سے کچھ سال پہلے شعر و ادب کا بڑا نمایاں مرکز رہا ہے، غور و فکر کے وہ سارے مرحلے جو علی گڑھ نے طے کئے، کبھی کسی اور جامعہ نے طے نہیں کئے، کبھی اس جگہ جہاں اب آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب دھرنگا سا سماں ہے، ایک محشر بپا تھا، ذہن کی تمام کمانیاں سب سے پہلے علی گڑھ میں کھلیں، اور علی گڑھ سب سے پہلے انسان کے بدلتے ہوئے حیاتیاتی اور نفسیاتی ماحول کو پالیا، علی گڑھ نے ایک ایسے کردار کو جنم دیا جس کی شگفتگی اور آزاد خیالی دوسروں کا سہارا ہو جائے زندگی کا آدرش بنالیا تھا، وہاں کی محفلیں

پہلے بے تکلف، بے باک، بے ریا، فرشتوں سے زیادہ خاکیوں کی اور سیاسی پلٹ نگاروں سے زیادہ ادیبوں کی تھی، (خدا کرے یہ ابر وہاں سے پھر اُٹھے) مذہب کی شدید تبلیغ میں وہاں کی آزاد فطرت نوجوانوں پر جو بندشیں روا رکھیں، اُس نے مذہب کے خوب اور ناخوب سے اُنھیں واقف کر دیا، صرف مذہبی قوانین ہی نہیں، بلکہ سماج کے خیر و شر کا مسئلہ اُن کے سامنے آگیا، وہ سوچنے لگے، کہ کل وہ اپنے جامعہ سے نکل کر کس طرح ایک دم توڑتے ہوئے سماج سے ادب کی رگوں کے لئے خون لے سکیں گے، یہی وہ نازک مرحلہ تھا جہاں وہ اپنی روایات سے باغی ہو گئے، اور اُنھوں نے دنیا کے اور فلسفوں کے بجائے ادب کو اپنی زندگی کا فلسفہ بنالیا، ظاہر ہے کہ مواد کی تلاش میں اُنھیں دور دور اور باہر جانا پڑا، مگر اس تگاپوئے دمادم میں اُنھیں یہ سوچنے کا موقع ملا کہ ہمارا ادراک اور ہماری آزادی ہماری صحت ہمارے رہنے سہنے کے طریقے اور ہماری تہذیب کہاں تک ہمارے تاریخی شعور کو بنا اور بگاڑ سکتی ہے، علی گڑھ نے ان پہلوؤں پر خواہ بلا ارادہ ہی زور دیا ہو، مگر اس طرح اُسنے اپنے ادیبوں کو ایک خاص وجدان اور ایک خاص آہنگ ضرور دیا ہے، ان ادیبوں میں سے شور بھی ہیں، آپ اُن کے کلام کا کوئی بھی حصہ دیکھیں اُس میں مصنف کا شعور اپنے ہی دائرہ میں فن کی تخلیق کرتا نظر آئے گا، خیالات کی فراوانی آورش اور اُصولوں کا انتخاب وجدان اور تخیل کی رسائی، جذبات اُن کا ٹھہراؤ، اُنکا رچاؤ اُن کا بیان، اُن کی رمزیت خارجی دنیا کے اثرات کا قبول کرنا اور اُن پر فیصلے ایک طرز نگارش اور ایک تاریخی شعور، حاضر دماغی، سنجیدگی، اور فکر تخلیق کے یہ گوناگوں پہلو اُن کی لے کے زیر و بم کا نظام اُن کا بالکل اپنا ہے شور کی خارجی دنیا اُن کی داخلی دنیا کی ہمزاد ہے، اُن کی کسی نظم میں بیمار، مضمحل، انفعالیت پسند زندگی کا احساس نہیں ہوتا، اگرچہ اُن کا دُکھ گہرا ہے، مگر اس میں شائستگی کے عناصر بھی ہیں، وہ انتہائی کرب اور غم کی حالت میں بھی ایک (Personal Satire) ذاتی طنز سے زیادہ جبر مشیت کے قایل نہیں ہیں، فطرت پر اس سے زیادہ شائستہ طنز اور کیا ہو سکتا ہے۔

اے سینۂ آسماں کے داغو! — اے تربتِ وقت کے چراغو!
شعلوں میں بھی تم ہو سایہ افگن — لاشوں کی جبیں بھی تم سے روشن
ڈوبی ہوئی کرب میں زمیں ہے — کیا عرش پہ زلزلہ نہیں ہے
ظلمت نے متاعِ نور لوٹا — تارا کوئی چرخ سے نہ ٹوٹا
کرنوں سے مرا پیام کہنا — سورج سے مرا سلام کہنا

(ڈوبتے تاروں سے)

شور کا موضوعِ سخن اور لوگوں کی طرح نوع انسان کی زبوں حالی کا ماتم ہے اُنکا میلانِ طبع اسی وجہ سے

حقیقت نگاری کی سمت ہے اور یہ حقیقت نگاری روایات کی صحت مند بصیرت کی وجہ سے بڑی نکیلی اور چبھ جانے والی چیز ہے، اُن کا ہر تجربہ جب تک وجدان کا حصّہ نہیں ہو جاتا اپنے لئے اس کی تلاش میں رہتا ہے، اُن کو اپنی انفرادیت کا کہیں بھی غلط گمان نہیں ہے، وہ بھی دُنیا کے میلان کا ایک حصّہ ہے۔ ایک ایسا حصّہ جو اُس کے اظہار کا ایک وسیلہ بھی ہو سکے، انانیت کا وہ آسیب جو "میں" کا ایک خول پیدا کر کے مرجاتا ہے، شور سے بہت دور ہے وہ ہر چیز کی از سر نو ترتیب اور تنظیم کے لئے ایک سوجھے بوجھے مسئلہ پر غور کرنے کو طیار ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں اُن کا لب و لہجہ اکثر بہت تیز اور طنزیہ ہوتا ہے، مگر تیر بہدف بھی، اس لب و لہجہ کی کھنک میں بظاہر جذباتیت کی وہ گونج بھی شامل ہے، جو صدیوں سے شاعری کی پامال اور مضمحل لے بنی ہوئی ہے مگر وہ رٹے ہوئے محاورے اور اُگلے ہوئے جذبات سے صرف دور ہی نہیں بلکہ مخالف سمت میں بھی ہے غیر ضروری عنصر کو نوچ کر پھینک دینا اور اس طرح کہ کہیں سے مسخ شدہ حصّہ کا پتہ نہ چلے بڑا مشکل کام ہے، زندگی کے بُت کو بے نقاب کرنا اور اس طرح کہ نقاب بھی تار تار نہ ہو خود بڑی فن کاری چاہتا ہے، ایسے فن کی تخلیق کے لئے جھلاہٹ، غصّہ اور شک سے زیادہ یقین کی ضرورت ہے، اس کاوش میں وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو زندگی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک جگہ جامد و ساکت رہ جانے کے قایل نہیں بلکہ راہ کی ناہمواری اور رات کی تاریکی کو دیکھتے ہوئے بھی آگے بڑھنے کے قایل ہیں، یہاں شاعر ایک ماہر فلکیات کی طرح اپنی ایجاد کے رموزِ پنہاں میں آپ گم ہو جاتا ہے، رات کے پردہ کو جو دنیا کی صحت اور خوبصورتی کو اپنی آغوش میں چھپا لیتا ہے، سورج کی ایک کرن چاک چاک کر دیتی ہے، انسان کی جستجو سورج کی ایک کرن سے کیا کم ہے، وہی صدیوں کے اندھیرے اور وہی سورج کی کرن جو اپنی بیتابی میں لا محدود ہے، تاریکی میں جب دم گھٹنے لگتا ہے، تو ایسی آوازیں گرتوں کو سنبھال لیتی ہیں۔

یہ اندھیرے سنگ اسود کی چٹانوں کے محل — آہ یہ خونابہ افشاں داستانوں کے محل
وہ محل قوموں کی تاریخیں بدلتی ہیں جہاں — وہ محل تاریکیاں سورج اُگلتی ہیں جہاں
وقت کی تقدیر ڈھلتی ہے اسی ظلمات میں — زندگی کروٹ بدلتی ہے اسی سکرات میں

یہ آواز اندھیرے میں اُجالے کا تصور ہے ایک موج تپاں کی جستجو ہے جو نہ جانے کب سے گرم سفر ہے، کام کی بات کہنا اور اس طرح کہنا کہ لب و لہجہ میں شخصیت کا پورا زور آجائے، ایسی بات کو آنے والے واقعات کا پیش خیمہ بنانا اور پھر نتائج کو اس طرح پیش کرنا گویا وہ بنیاد سے چھت تک ڈھلی ہوئی تیر ہے بڑی تعمیری صلاحیت چاہتا ہے۔

شور کی نظموں میں اس تعمیری کلیت کا بڑا نمایاں ادراک ظاہر ہوتا ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اُن کی کچھ

نظمیں جھلاہٹ میں لکھی گئی ہیں اور اُن کا لب ولہجہ عام سطح سے اوپر نہیں، مگر اُن کی اکثر نظموں کا قوام اُنکے مزاج اور اُن کی شخصیت سے بنا ہوا ہے، وہ اپنی نظموں کے رچانے میں جس طرح مواد کا خیال رکھتے ہیں، اُس کی مناسبت سے الفاظ کی تراش خراش پر بھی اُن کی نظر ہوتی ہے، وہ اس بات کا بہت خیال رکھتے ہیں کہ کون سا ستون کون سی محراب کون سا گنبد کہاں ہونا چاہئے اور روشنی اور صفائی کا انتظام کن کھڑکیوں اور دروازوں کو نصب کرنے سے اچھا ہوگا، اُن کی عمارت گری بڑے مزے کی چیز ہے، کبھی کبھی عمارت کی دیوار پر ہلکا سا نقش بڑی واضح نقاشی کا نمونہ ہوکر رہ جاتا ہے، اُن کے کلام کی رمزیت اگرچہ بڑی مبہم ہے، مگر بہت واضح ہے، علامتیں جن کے گرد انسان کا تاریخی شعور سمٹتا رہتا ہے، زندگی کے مشکل ترین مسایل کا تجزیہ کرنے میں ہماری بڑی امداد کرتے ہیں، خفّاش اندھیرے کا پرستار ہے، اس علامت سے قدیم رجحانات کی وابستگی اور خورشید سے زندگی کی نئی روشنی کی اتنی صاف علامت ہے جو بغیر کسی کاوش کے آسانی سے صاف سمجھ میں آسکتی ہے۔

خفّاش :— کسی عارض پہ تابانی نہیں ہے
جبینِ مہرِ عالمتاب کب ہے
تری مشعل ہے اے خورشید بے نور
منوّر کوئی پیشانی نہیں ہے
یہ صدیوں کا توہم کیا غضب ہے
اندھیرے میں نہاتے ہیں یہاں طور

خورشید :— تری دنیا ہے وہ دنیائے تاریک
جہاں ہر قہقہہ اک دل بجھا دے
نظر کم ظرف عقل و ہوش نادار
جہاں اندھے کریں جلووں کی تضحیک
فرشتوں پر ہنسیں ابلیس زادے
ہزاروں ذہن کے مفلوج و بیمار

اگرچہ شور کی علامتوں کے انتخاب کا دائرہ وسیع نہیں، مگر وہ جامعیت میں آپ اپنا جواب ہے، اُردو شعرا کی بہت بڑی مشکل یہ ہے کہ اُن کی کثیر تعداد مسلمان ہے، اور اُن کا وطن ہندوستان ہے، اُن کی ابتدائی تعلیم و تربیت قصص الانبیا سے شروع ہوتی ہے، بچّوں کی نفسیات پر مذہب کا یہ ہوا کیا اثر کرتا ہے، اس سے بحث نہیں، مگر جن کے ذہن سنبھلے ہوئے ہیں انھوں نے نئی علامات نئے نشانات ڈھونڈ نکالے ہیں، (میرا اپنا یہ خیال ہے کہ اقبال کے کلام میں اسلام صرف ایک علامت ہے، اگر ملٹن اپنی فردوس گم شدہ سی عیسائیت کو ایک علامت قرار دے سکتا ہے، اور ٹیگور ویدانتی فلسفہ پر غیر فانی ادب کی تعمیر کر سکتے ہیں، تو ان کہانیوں کو ادب میں برتنے سے حجاب کرنا کون دانشمندی ہے، بلکہ افسوس ہے کہ اسلام نے ابتک بہت سی خیال آرائیوں پر بندشیں روا رکھی ہیں) بات تھی شور کے انتخابِ علامت کی، شور ایک تنگنائے میں کام کرتے ہیں مگر اپنے اشعار کے ٹکڑوں میں ایسا زندہ نشان رکھ دیتے ہیں کہ انسان کی مایوسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

مرہم حج و زیارت زخمِ دینار و درم،
میرے ناسوروں سے چھلنی سینۂ مصر و عجم

میرے بوجہلوں کی زد پہ ہر سمیر کا وقار
کھیلتے ہیں میرے زناری خداؤں کا شکار

عفتوں کے خون سے شاداب میری وادیاں
رقص کرتی ہیں مرے سازوں پہ مریم زادیاں

اطلس و دیبا میں بھی عریاں رہیں جنکے بدن
اُن غلاموں کے بھی ماتھوں پر ہے سونے کی شکن

شور کی لے میں بڑی تیز جلتی ہوئی آگ کی آنچ محسوس ہوتی ہے، مگر یہ آگ بھڑک کر بجھ جانے والی نہیں یہ آگ انسان کی صدیوں سے ہر بات کا تجزیہ کرنے والی کوکھ سے اُٹھتی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کوکھ اندھی نہیں، اس کی ایک زندہ مثال اُن کی نظم "سیاروں کی آواز" ہے اُردو کے جدید ادب میں اس نظم کا مقام تو وہ نقاد دریافت کریں گے جن کے ذمہ ادب کی صحت مند تعمیر کا بوجھ ہے، مگر میں ادب کے ایک حقیر طالب علم کی حیثیت سے اس کو علامت کی شائستہ ترین مثال سمجھتا ہوں۔

مریخ:- یہ سلگتی ہوئی دنیا یہ چٹختے ہوئے سر
بامِ تہذیب پہ جلتے ہوئے جبریل کے پر

یہ دہکتی ہوئی حکمت، یہ تمدن کا دھواں
خونِ آدم کو کروں اور ابھی کچھ ارزاں

یہ گناہوں کے نشیمن یہ شبستاں یہ محل
آدمی خوار خداؤں کے یہ خونیں ہیکل

اِن کی مٹی سے مجھے خون کی بو آتی ہے
مرے سینے میں مری سانس گھٹی جاتی ہے

دفترِ حکمت و الہام کو جلنے دو ابھی
قالبِ دہر میں ظلمات کو ڈھلنے دو ابھی

پھونک کر عقل و سیاست کی دوکانیں رکھ دو
سینۂ خاک پہ ظلمت کی چٹانیں رکھ دو

آفتاب:- جلوے نادیدہ پسِ پردۂ خواب اور بھی ہیں،
اُٹھنے والے مرے چہرے سے نقاب اور بھی ہیں

میری تابندہ جبیں سے وہ کرن پھوٹے گی،
وقت کی گود میں صبحوں کی لڑی ٹوٹے گی

سونپ دو سینۂ ایام کو چھینے ہوئے راگ
بخشد و خون میں لتھڑی ہوئی دنیا کو سہاگ

جو تلاطم میں بہے ہوں وہ ترنم دیدو
جو ہواؤں سے بجے ہوں وہ تبسم دیدو

تا کجا! سلسلۂ چشمکِ پیکان و تبر
آؤ اِن سُرخ فضاؤں میں اُچھالیں ساغر

حادثو توسنِ ایام کو مہمیز کرو!
انقلابوں کی ہواؤں کو ذرا تیز کرو،

تابشِ زہرہ و انجم کو تہِ دام کریں
کھلکھلاتے ہوئے محلوں کی ہنسی عام کریں

دنیا کے ہنگاموں کا اُن کو مکمل احساس ہے، اور کبھی کبھی اُن کی بے ترتیبی، اُن کی ہلچل اُن کی گڑبڑ سے شور کی شگفتہ مزاجی پر چوٹ بھی لگتی ہے، وہ بڑی حد تک مایوس ہو جاتے ہیں اسی لئے فطرت اور انسان کی سفاکیوں کا بڑے سخت اور کڑوے لہجے میں ذکر اُن کے یہاں بھی مل جاتا ہے۔

لَو چراغِ سحر و شام کی تھرّاتی ہے
زندگی خون کے چھینٹوں سے بجھی جاتی ہے

وہی ہیکل وہی معبد وہی طاعت کا نظام
دیر شرمندہ، فلک بوس کلیسا بدنام

اس میں کیا قادر و قیوم کی رسوائی نہیں
ننگ کیا آدمی زادے کی جبیں سائی نہیں

مرکزِ ثابت و سیّار ہے قدرت کس کی،
دام افگن ہے دو عالم پہ مشیت کس کی

کس نے سورج سے کہا ہے کہ اُجالا نہ کرے
اپنی صبحوں کو اندھیروں سے نکالا نہ کرے

زندگی آج تغیرّات سے گزر رہی ہے، انسان کی بے حس اور مایوس زندگی نے ایک کروٹ لی ہے، مگر ابتک تشنگی، اور شکستگی کے آثار مٹے نہیں ہیں، ہماری زندگی میں حسن و خوبصورتی کا شعور تک ایک محدود فضا میں خشک ہوتا جا رہا ہے، مگر شور نے ایک مہذب شاعر ہونے کی حیثیت سے زندگی کے اس پہلو پر بھی جو نظر کی ہے، بڑی غایر ہے، زندگی کی وسعت اور پہنائی سے شعور کو ہم آہنگ کرنا لاشعور کی بھول بھلیاں سے سچے جذبات کو صاف اور بغیر مجروح کئے نکال لانا جنسیاتی تجربہ کا وجدان کے ساتھ ساتھ حقیقت کی صورت میں ظاہر کرنا انکی شخصیت کے ارتقا کا پتہ دیتا ہے، یہ سفر کچھ ایسا آسان نہیں ہے کہ منزل پر پہونچنے والے کو داد نہ دی جائے۔

یہ شبابوں کے شفق زار یہ سینوں کی سحر
عارض و رخ کے یہ سورج یہ جبینوں کے قمر

یہ بھرے سینوں کی محراب یہ عریاں بازو،
کتنے نظاروں میں شامل ہے نگاہوں کا لہو

مجھ سے مت پوچھ نگارانِ گل اندام کے خواب
جرمِ ناکردہ گنہ گار ہے آدم کا شباب

ایک احساس جنوں خیز پہ لاکھوں الزام
مسکرانا بھی خطا آنکھ اُٹھانا بھی حرام،

اُن کی شاعری کا کوئی پہلو ہو، اُس میں بڑی صحت اور بڑی شگفتگی پائی جاتی ہے اور انھیں کیفیات کی وجہ سے فراق صاحب کا یہ فیصلہ کہ وہ بڑے مضبوط شاعر ہیں درست ہے اِنھیں عناصر کی بنیاد پر آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی اور نیاز اُن کو اُردو کے جدید شعرا میں بڑا کامیاب شاعر سمجھتے ہیں، علیگڈھ کو اپنے اس فرزند کو بھولنا نہیں چاہئے۔

حامد عزیز مدنی

چند نہایت ضروری باتیں

۱- اپنا نمبر خریداری جو ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے، اسے نوٹ کر لیجئے اور خط و کتابت میں اسکا حوالہ ضرور دیجئے — (۲) اگر پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع ۲۰ تک ہمیں نہ ملی تو پھر پرچہ کسی طرح نہیں مل سکتا۔
(۳) جواب کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجئے ورنہ جواب کی توقع نہ رکھئے۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

(از فراق گورکھپوری)

نگار بابت ستمبر ۱۹۴۶ء میں ایک مضمون "فراق کی عشقیہ شاعری" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ اس مضمون میں میرے اس مضمون کے خلاف ہاتھ پاؤں مارا گیا ہے جو "عشقیہ شاعری" کے عنوان سے نگار کے پچھلے سالنامہ میں نکلا تھا۔ اپنے مضمون کے دوران میں میں نے لکھا تھا کہ انگریزی ادب میں رومانی نشاۃ ثانیہ (Romantic Revival) کے کئی مشہور شعرا یعنی ورڈسورتھ، شیلی، کیٹس اور کولرج نے عشقیہ شاعری نہیں کی، میرے اس بیان پر ایک یہ اعتراض فرمایا گیا ہے کہ چونکہ یہ شعرا "رومانی" دور کے شعرا تھے اس لئے انھوں نے ضرور عشقیہ شاعری کی۔ جب میں نے یہ اعتراض الہ آباد یونیورسٹی میں اپنے ہم پیشہ انگریزی کے پروفیسروں کو سنایا تو ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ لوگ کہنے لگے کہ چونکہ اردو میں "رومانی" کے معنی "عشقیہ" لئے جاتے ہیں اس لئے بیچارے نے یہ طے کر لیا کہ رومانی دور کے ان انگریزی شعرا نے ہو نہ ہو ضرور عشقیہ شاعری فرمائی ہوگی۔ کیا کہنے ہیں! رومانی نشاۃ ثانیہ کا مطلب کوئی بچہ بھی "عشقیہ دور شاعری" نہیں سمجھتا۔ اس دور میں نیچر فلسفہ اور انسانی زندگی کے سیاسی، اخلاقی و روحانی مسائل پر شاعری کی گئی ہے۔ انگریزی ادب کے آغاز سے انجام تک کسی دور میں اتنی کم اور اتنی معمولی نوعیت کی عشقیہ شاعری نہیں کی گئی جتنی انگریزی شاعری نہیں کی گئی جتنی انگریزی شاعری کی رومانی نشاۃ ثانیہ میں۔ ورڈسورتھ کا پورا کلام ایک ہزار صفحہ کا ہے جس میں وہ حصہ جسے کچھ احمق عشقیہ شاعری بتائیں گے صرف دو یا تین صفحوں میں آجائے گا۔ لیکن لوسی سے متعلق نظمیں (Lucy Poems) عشقیہ شاعری نہیں ہیں۔ اور اگر ایک ہلکی سی چاشنی ان دو یا تین صفحوں میں آجانے والی نظموں میں معمولی عشقیہ جذبات کی آ بھی گئی ہے یا چونکہ اپنی بی بی پر ایک نہایت معمولی ہلکی پھلکی نظم دس پندرہ اشعار کی ورڈسورتھ نے سپرد قلم کر دی تو اس سے یہ نتیجہ صرف ایک گھامڑ ہی نکالے گا کہ ورڈسورتھ نے کوئی قابل ذکر عشقیہ شاعری ہے۔ آج تک ورڈسورتھ پر ہزاروں صفحات لکھے جا چکے ہیں لیکن کسی لال بھبکڑ نے ورڈسورتھ کے یہاں عشقیہ شاعری نہیں پائی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ چونکہ میر انیس نے حضرت قاسم سے کربلا کے میدان جنگ میں

جاتے ہوئے چند الوداعی فقرے ان کی بی بی کو مخاطب کر کے کہلوا دئے ہیں اس لئے اس بند کو عشقیہ شاعری کی مثال میں پیش کیا جائے۔ کولرج کا کلام چار سو صفحات میں ہے جس میں دس پندرہ مصرعوں کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے عشق (Love) جسے معترض صاحب نقل کر کے اس خیال سے جھوم رہے ہیں کہ میں نے کولرج کے یہاں سے چار مصرعے عشق پر نکال ہی تو دئے۔ شیلی کا کلام چھ سات سو صفحات کا ہے جس میں Epipsychidion ایک تنہا نظم عشق کے عنوان پر ہے لیکن یہ نظم ایک ہوائی اور ماورائی چیز ہے۔ شیلی کی زندگی اور شاعری میں جنسیت تھی ہی نہیں۔ اس کی دونوں شادیاں جنسی ترغیبوں سے معرا تھیں اس پر تمام مورخین ادب متفق ہیں۔ کیٹس زندگی میں تو حسن و عشق کی آگ میں پھُنک اُٹھا تھا لیکن قریب چار سو صفحات جو اس کے کلام میں ہیں ان میں دریا ایک سانیٹ پر لکھنے کے علاوہ اس نے عورت اور مرد کی محبت کے موضوع کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔

میری دوسری بات جس پر اعتراض فرمایا گیا ہے یہ تھی کہ کالیداس، بھوبھوتی، بھرتری وغیرہ سنسکرت کے مشہور شعرا نے جتنی رنگین اور بلند پایہ عشقیہ شاعری کی ہے اس کے مقابلہ میں اُردو کی عشقیہ شاعری پست رہی ہے۔ یہ ایک مُلی ہوئی حقیقت ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مندرجۂ بالا سنسکرت شاعروں کی عشقیہ یا غیر عشقیہ شاعری میں ہوسناک ذلیل جذبات ہیں۔ بہت زمانہ ہوا حضرت نیاز نے رامائن اور مہابھارت کا دنیا بھر کی رزمیہ نظموں ( ) سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "دنیا کے کسی زبان کا رزم نامہ وہ جگمگاتے ہوئے اخلاقی عناصر اپنے اندر نہیں رکھتا جو رامائن اور مہابھارت میں ملتے ہیں"۔ انسانی تاریخ میں اگر چوٹی کے دس بارہ شعراء کی فہرست مرتب کی جائے تو جرمن شاعر و مفکر گیٹے (Goethe) کا نام ضرور آئے گا۔ گیٹے نے لکھا ہے کہ اگر ایک لفظ میں زندگی کے تمام رموز اور زندگی کی تمام اعلیٰ قدروں کا ذکر کرنا ہو تو صرف شکنتلا (کالیداس کا مشہور عالم ناٹک) کہہ دینا کافی ہے۔ امرسن کی حیثیت سمجھ سکنے کی توفیق اگر معترض کو ہو تو امرسن کا یہ قول بھی سُنا دوں کہ "سنسکرت ادب دنیا بھر کے ادب سے اخلاقی عناصر میں بالاتر ہے"۔ ڈاکٹر اقبال نے سنسکرت ادب کے مشاہیر کے سامنے اپنی فارسی نظموں میں سرِ تسلیم خم کیا ہے اور بھرتری ہری کے شعر کا ترجمہ زیب عنوان کے طور پر بال جبریل کے سرنامہ پر دیا ہے۔ دُنیا بھر کی زبانوں میں Sacred Books of the East کا سیکڑوں جلدوں میں ترجمہ کیا گیا ہے جس کا نوے فی صدی حصہ سنسکرت ادب پر مشتمل ہے۔ لیکن اس دریدہ دہنی اور قابل رحم ذہنیت کو دیکھئے کہ معترض صاحب فرماتے ہیں کہ میرے بتائے ہوئے مشہور عالم سنسکرت شعرا نے ہوس پرستانہ اور سڑی گلی قسم کی مخرب اخلاق عشقیہ شاعری کی ہے۔ سنسکرت ادب

اس جگمگاتے ہوئے زمانہ کی یادگار ہے جب ہندوستان جگت گرو تھا۔ کیوں جگت گرو تھا، کیا بقول معترض ہوس پرستانہ شاعری کرکے؟ امیر مینائی نے صحیح کہا ہے:۔ "مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے"۔ بڑا غضب ہے جب حالی کہیں کہ:۔ "جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے" جب مصنف شعرالہند کہے کہ "اردو شاعری فارسی شاعری سے پست ہے" جب مولانا شبلی، شعرالعجم میں اتنی بڑی بات کہہ جائیں کہ "ہندوستان آکر فارسی شعرا کے کلام میں وہ پاکیزگی وہ طہارت ولطافت و نرمی آگئی جو حافظ و سعدی کے یہاں بھی نہیں ہے (ظاہر ہے کہ مولانا شبلی کی مراد ہندوستان کی اُس فضا سے ہے جسے صدیوں سے یہاں کے رشی منی اور سنسکرت کے ہندو شعرا پاک بنا چکے تھے نہ کہ وہ فضا جسے مغل دربار یا لال قلعہ نے پیدا کی تھی کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو جائے گا کہ مغل حکمران خسرو، نظیری، بیدل اور عرفی سے زیادہ روحانیت و طہارت قلب کے مالک تھے) تب تو یہ تعریفیں چپ چاپ سُن لی جائیں لیکن جب سنسکرت ادب کا نام آئے تو ان کی تیوریاں چڑھ جائیں۔ جو لوگ ایسے ہیں کہ ان سے کچھ اونچی قسم کی باتیں کہی جائیں اُن سے میں یہ ضرور کہوں گا کہ سنسکرت ادب کی روح کو جذب کئے بغیر اُردو کو ہندوستان کا آب و دانہ لگ نہیں سکتا۔ بغیر ایسا ہوئے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ اُردو کو اُن معنوں میں ہندوستان کا ادب ہونا ہے، جن معنوں میں ٹیگور کا ادب ہندوستان کا ادب ہے، جن معنوں میں اجنتا کا آرٹ ہندوستان کا آرٹ ہے جن معنوں میں تان سین کا نغمہ ہندوستان کا سنگیت تھا اور جن معنوں میں رامائن، مہابھارت، کالیداس، بھوبھوتی اور بھرتری ہری کی شاعری ہندوستان کی شاعری ہے۔

ایک جگہ معترض صاحب فرماتے ہیں کہ فراق نے یہ لکھا ہے کہ "شہوانی یا جنسی جذبہ جب تک اپنے اندر عشق کے عناصر جذب نہ کرلے عشقیہ جذبہ نہیں کہلا سکتا"۔ اعتراض یہ ہے کہ فراق نے عشق کے عناصر کی تشریح نہیں کی۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے ایک سمجھدار آدمی بھوچکارہ جائے۔ تھوڑی سمجھ بوجھ والا آدمی بھی اتنا جانتا ہے کہ جنسی کشش کا صرف جنسی لذت کشی کے وقفوں تک قایم رہنا ہوس کاری ہے۔ اگر اس کشش میں استقلال پیدا ہو جائے (جو صرف اچھے آدمی کی زندگی میں ہو سکتا ہے) تو جنسیت عشق کی منزلوں کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئے گی۔ اسی عدم استقلال سے سطحی، چھچھوری، یا واسوخت نما عشقیہ شاعری پیدا ہوتی ہے۔ جب جنسیت میں استقلال پیدا ہوگا تو عاشق کے شعور پر جمالیاتی قدریں آئینہ ہونے لگیں گی، معشوق کے تصور میں نرمی اور طہارت پیدا ہونے لگے گی، معشوق سے متعلق خیالات میں، معشوق کی یاد میں ایک چمکار پیدا ہونے لگے گا اور جنسی جذبہ میں نیکی اور خیر و برکت کے عناصر سرایت کرنے لگیں گے، معشوق کا حسن ستاروں کو تابندگی دیتا ہوا نظر آئے گا، معشوق کے

روپ میں طہارت کا احساس ہونے لگے گا۔ معشوق کی محدود شخصیت لامحدود کی خبر لاتی ہوئی دکھائی دینے لگے گی۔ ان احساسات سے شاعر کی روح کو نیا جنم لینے کی توفیق پیدا ہوگی اور دنیا بھی نیا جنم لیتی ہوئی نظر آئے گی۔ انسانی شرافت کی نشاۃ ثانیہ انھیں احساسات سے شروع ہوتی ہے۔ یہی اثرات سنسکرت کی عشقیہ شاعری میں جاری و ساری ہیں۔ انھیں اثرات سے عورت کے تصور میں دیویت کی جھلک پیدا ہوتی ہے اور محبوبہ، ماں، بہن، بیٹی، گھر کی لکشمی اور دیوی کی حیثیت سے بھرپور عشقیہ شاعری کی محرک بن جاتی ہے اُردو شاعری میں بلکہ بہت حد تک عربی و فارسی شاعری میں بھی عورت کا ایسا تصور ابھی جنم نہیں لے سکا ہے اگر میں نے ایسی بات کہہ دی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اُردو شاعری کے مستقبل سے مایوس ہوں یا میرا شیوہ اُردو دشمنی ہے۔ اُردو کی عشقیہ شاعری کے ایک حصّہ میں سچّی عشقیہ شاعری کے عناصر موجود ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ اُردو کی عشقیہ شاعری کی نشاۃ ثانیہ ہو یہ ناگزیر ہے کہ عورت کے متعلق ہمارے شعور کی گہرائیوں ایک ایسا خلاقانہ عمل (Process) کارگر ہو جو ایک انقلاب کا حکم رکھتا ہے اور اس عمل کو جنم دینے میں سنسکرت ادب اور دُنیا بھر کی بلند ترین عشقیہ شاعری کی روح ہماری روحوں کو جذب کرنا ہوگی میں تو اُردو والوں کو ایسی ہدایت دینا اُردو کی اور اُردو والوں کی سب سے گراں بہا خدمت سمجھتا ہوں۔ میری نیت شرمندہ نہیں، میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کرتا۔ میں نے عمر بھر کیا ہی کیا ہے سوا اُردو شاعری میں شرافت کے عناصر پیوست کرنے کے اور نثر کے ذریعہ سے تخئیل و تصور میں کلچر اور شرافت پیدا کرنے کی ترغیب و تحریک پیدا کرنے کے۔ جہاں یہ آوازیں اُٹھتی تھیں کہ

غضب کی آنکھ تو ہے لطف کی نظر نہ سہی — یا — اک نگاہِ لطف میں سارا گلا جاتا رہا

مروت بھی ہو تری آنکھ میں کاش — رسیلی ہے کٹیلی ہے، بڑی ہے

وہاں۔ میں نے اُردو کو ایسے نغمے دئے

وہ تیری نرم دوشیزہ نگاہی دل نہیں بھولا — پڑی جب جب نظر تیری نگاہ اولیں نکلی،

نگاہِ یار بڑھ چلی حدودِ جور و لطف سے — بدلتی جا رہی ہیں بزمِ ناز کی روائتیں

چھڑ گئی اُن آنکھوں کی بات — دنیا میں اب دن ہے نہ رات

مجھے جگا رہا ہے موت کی غنودگی سے کون — نگاہوں میں سہاگ رات کا سماں لئے ہوئے

نگاہِ یار تجھ سے اپنی منزلیں میں پاؤں گا — تجھے جو بھول جاؤں گا تو راہ بھول جاؤں گا

دیکھا آپ نے، سنسکرت ادب کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر سنسکرت شاعری کی روح کو اپنے اندر جذب کر کے لہجہ کس طرح نیا اُٹھتا ہے۔

مالہ و ماعلیہ

(از غلام ربانی عزیز، ایم۔ اے)

مولانا شبلی کے وہ خطوط، جو انھوں نے، فیضی خاندان کی خواتین کو وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ آج کل پھر زیر بحث ہیں۔ اور خالد حسن صاحب قادری، مولانا کی وہ تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جو ان خطوط کے آئینے میں محفوظ ہے جب سے غالب کے خطوط طبع ہوئے ہیں۔ بہت سے اہلِ قلم حضرات کے خطوط لوگوں کے سامنے آگئے ہیں۔ اور جنھیں سوء اتفاق سے یہ عزت تا حال نصیب نہیں ہوئی۔ کاغذ سے کنٹرول اُٹھنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

اس میں شبہ نہیں کہ بہترین خطوط اُردو ادب کا نہایت قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ اور ہمیں ایسے خطوط کی دل کھول کر داد دینا چاہئے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اس مرض نے وبائی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور لوگ ہیرو پرستی کے جذبات کی رو میں یوں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ کہ 'خیر و شر' کا امتیاز ہی باقی نہیں رہا۔

خطوط کی اہمیت کے دو ہی پہلو ہو سکتے ہیں۔ علمی، ادبی یا تاریخی۔ غالب کے خطوط میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ ادبی حیثیت سے ان کا جو درجہ ہے۔ وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ غالب کے زورِ قلم نے خطوط نویسی کا وہ معیار قایم کر دیا ہے کہ بڑے بڑے جلیل القدر ادیبوں کے خطوط پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں کو اس صنفِ ادب پر خامہ فرسائی کرتے وقت ہو کیا جاتا ہے۔ میری نظر سے اس وقت تک خطوط کے جس قدر مجموعے گزر چکے ہیں۔ ان میں کوئی مجموعہ بھی ایسا نہیں کہ اسے کوئی امتیازی حیثیت حاصل ہو۔ غالب کے انھیں خطوط کو پیشِ نظر رکھ کر مولانا غلام رسول مہر نے غالب کی جو شبیہ کھینچی ہے۔ وہ ملک کے تمام اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ مہر صاحب اس جدت خیال کے لئے ضرور مستحق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے غالب کی کہانی خود اس کی زبانی بیان کر دی۔ اور انھیں ایسی ترتیب دیدی کہ غالب کی زندگی کے تمام خدوخال ہماری آنکھوں کے سامنے آگئے۔ لیکن کتاب کی قدر و قیمت کا اصلی دارومدار ان نقوش و خروف پر ہے۔ جو خود غالب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

ذکر اس پری رخ کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مولانا شبلی کے مذکورہ بالا خطوط پر اسی معیار کے پیشِ نظر کچھ عرض کرنا منظور ہے اور دیکھنا ہے کہ مولانا نے اُردو انشا پردازی کا جو معیار اپنی دوسری کتابوں میں قایم کیا ہے۔ ان خطوط کا درجہ ان کتب کے مقابلہ میں کیا ہے۔ اور آیا وہ اس قابل ہیں کہ مولانا کے معیاری ادبی کارناموں کی فہرست میں ان کو بھی شامل کیا جاسکے سلاست اور روانی مولانا کی تحریرات کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور انھیں اُردو زبان پر اتنی قدرت حاصل ہے کہ ادائے مطالب کے لئے جو صورت چاہیں اختیار کرلیں اور کانوں کو بار نہ معلوم ہو۔ میں مولانا کے ان خطوط کو، اور خصوصیت سے ان خطوط کو جو انھوں نے 'عطیہ فیضی' کو لکھے ہیں اس معیار پر پورا اُترتا نہیں پاتا اور یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ مولانا کا سمندِ قلم قدم قدم پر لڑکھڑا جاتا ہے۔ زورِ بیان کا تو کیا ذکر، سلاست اور روانی تک ناپید ہیں۔ اُکھڑے اُکھڑے فقرے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سلسلۂ کلام کو قائم رکھنے کیلئے مولانا خاص اہتمام سے کام لے رہے ہیں۔ اور اگر ذرا غافل ہو جائیں تو رشتۂ بیان ہاتھ سے نکل جائے۔

'زہرا فیضی' کے نام جو خطوط ہیں۔ ان کا بھی تقریباً وہی حال ہے، لیکن ان خطوط کی تحریر کے مطالعہ سے یہ فرق ضرور محسوس ہوتا ہے کہ مولانا بہت زیادہ کھوئے ہوئے نہیں ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مولانا کے ان خطوط کے پڑھنے سے مجھے کچھ مایوسی سی ہوئی اور یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ خطوط اسی آدمی کے قلم سے نکلے ہیں، جو سیرت اور الفاروق کا مصنف ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان خطوط کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کو اُردو زبان سے بالکل معمولی واقفیت ہے اور مولانا انھیں اُردو زبان کے سیکھنے کی طرف یوں مائل کر رہے ہیں۔ جس طرح مائیں اُنگلی پکڑ کر چھوٹے بچوں کو قدم قدم چلنا سکھاتی ہیں۔ لیکن میں یہ کیونکر مان لوں کہ شبلی نے ان خطوط کے لکھتے وقت قلب ماہیت کرلی تھی مولانا محمد حسین آزاد کی طرزِ تحریر سے کون آشنا نہیں۔ مگر کسے یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ اُردو کی پہلی کتاب جس کا پہلا سبق "ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے" سے شروع ہوتا ہے۔ اس آزاد کے قلم سے نہیں نکلی۔ جسکے اعجاز خامہ نے 'آبِ حیات اور دربار اکبری' کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں سب سے اونچی کرسی عطا کی۔ اور کوئی عجب نہیں کہ کچھ عرصہ بعد زبان کا نقاد شبلی کے طرف ان خطوط کے انتساب کو وہی وقعت دے جو اس وقت سعدی کی طرف کریما جیسی بے مایہ کتاب کے انتساب کو حاصل ہے۔

ہم جس عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ اس میں عورت کی صحیح حیثیت تا حال متعین نہیں ہوئی۔ اور حق یہ ہے کہ ہماری معاشرت میں جب تک چند خوشگوار تبدیلیاں نہ ہولیں، ہمیں مغرب کی اندھا دھند تقلید سے پہلو بچا کر ہی چلنا چاہئے۔ جوانوں اور خام کاروں کا تو کیا ذکر، بڑے بڑے تجربہ کار اور عمر رسیدہ لوگ اس ابتلا میں پورے نہیں اُتر سکتے۔ ہم نے اچھے خاصے سلجھے ہوئے لوگوں کو دیکھا ہے کہ جنس نازک سے

گفتگو کرتے وقت رعشہ براندام ہوجاتے ہیں۔ خصوصیت سے جب ان کا مخاطب دوست حسن کے ساتھ جوانی سے بھی بہرہ ور ہو۔

مولانا شبلی کے تعلقات ان خواتین سے ۱۹۰۸ء میں قایم ہوئے، یعنی آج سے کم وبیش چالیس برس پیشتر۔ اور غالباً یہ اپنی نوعیت کا پہلا تعلق تھا۔ جو اس عہد کے ایک عالم کا دو غیر محرم عورتوں سے قایم ہوا۔ اس وقت امر زیر بحث یہ ہے، کہ مولانا کے اس تعلق کی حیثیت کیا تھی۔ 'عشق ومحبت' یا کوئی اور، اس وقت تک جس قدر حضرات نے اس تعلق پر بحث کی ہے۔ ان کا نظریہ یہی رہا ہے۔ کہ مولانا کو عطیہ سے تو یقیناً محبت تھی، زہرا سے ہو نہ ہو۔ اور اس تعلق کے ثبوت میں دلایل وبراہین کا اچھا خاصہ طومار جمع کرلیا ہے۔ جس کا تار وپود انھیں خطوط کے تاروں سے طیار کیا گیا ہے۔

ہماری دانست میں وہ لوگ راستی پر نہیں ہیں، جنھوں نے ان خطوط کی شہادت کی بنا پر مولانا کے اس تعلق کو عشق ومحبت کے نام سے سرفراز فرمایا۔ عینی شہادت اور چیز ہے۔ اس وقت بھی درجنوں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جنھوں نے مولانا کی صحبت سے اکتساب فیض کیا ہے۔ اور بہت ممکن ہے۔ کہ خود مولانا کی زبانی ہی انھوں نے اس داستانِ حسن وعشق کی روداد سنی ہو۔ اور مولانا نے کسی وقت احتیاط سے کام نہ لیتے ہوئے اس "جرم" کا اقرار کیا ہو۔ لیکن یہاں موضوع گفتگو یہ ہے۔ کہ آیا ان خطوط میں ایسا مواد موجود ہے کہ مولانا کو جمہور کی عدالت میں جرم عشق کا 'مجرم' گردانا جاسکے۔

ہر چند محبت کرنا کوئی ایسا فعل نہیں۔ کہ جو بیچارے مولانا سے ہی پہلی بار سرزد ہوا۔ بلکہ اس کے متعلق تو حافظ کا فتویٰ ہے:۔ "ایں گناہ است کہ در شہرِ شما نیز کنند" لیکن سوءِ اتفاق سے ان خطوط کی شہادت اس قدر ناکافی ہے کہ جب غور سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ تو اس کی حقیقت ایک الزام سے زیادہ نہیں رہتی۔

جس طرح روشنی اور گرمی آگ کے لوازمات سے ہیں۔ اسی طرح سوز وگداز عشق کا لازمہ ہیں۔ آپ اس خط وکتابت کو بالاستیعاب پڑھئے، اور غور سے پڑھئے۔ کوئی فقرہ ایسا نہیں پایئے گا جس پر آپ ذرا ٹھٹکیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مولانا اس تمام خط وکتابت میں جو تین سال کے طولانی عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اتنے محتاط رہ سکے ہوں کہ عطیہ کو خط لکھیں اور قلم بے قابو نہ ہوجائے۔ اور جذبات کے سمندر کی سطح پر سکون ہی رہے۔ بادی النظر میں یہ خطوط کاروباری خطوط معلوم ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مولانا کا عشق جوانی کا طوفانی عشق نہیں ہے کہ تمام بندھنیں توڑ کر کائنات پر چھا جائے۔ لیکن محبت پھر بھی محبت ہی ہے۔ آپ بھی اس منزل سے گزر چکے ہیں۔ کبھی اتنی احتیاط برت سکے اور اگر آپ کو پھر سے موقع دیا جائے تو کیا اس احتیاط کا امکان ہے۔

مولانا کے ان خطوط میں اسی عنصر کے فقدان نے مجھے مجبور کردیا کہ ان کے 'دامنِ پارسائی' کو اس

'نارِ داغ' سے ملوث نہ ہونے دوں۔ زیادہ سے زیادہ جس چیز کا مجھے احساس ہوا ہے۔ وہ ایک مصنوعی ربودگی ہے۔ جس کا اظہار مولانا نے اکثر ضروری جانا اور جس کے لئے مولانا نے مختلف پیرے بدلے۔ کتاب کے انتساب کا لالچ دلایا۔ کمرہ بنوانے کی تجویز بھی ہوئی۔ انشائے اُردو کی درستی اور فارسی کی تعلیم کی خدمت بھی اپنے ذمہ لی۔ لکھنؤ آنے کی دعوت اور بمبئی کے سفر کے وعدے بھی ہوئے۔ بارہا یہ درخواست بھی کی کہ عطیہ کوئی چیز پسند کریں۔ تو شبلی جان دینے سے دریغ نہ کریں۔ لیکن ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی جو چیز عنقا ہے۔ وہ حقیقی سوز و گداز ہے۔ جس کے بغیر عشق و محبت کا دعویٰ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

خود ان خطوط میں داخلی شہادت ایسی موجود ہے۔ جو میرے بیانات کی تصدیق کرتی ہے۔ ان خطوط کی ابتدا فروری ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ جو مجموعہ خطوط میرے زیرِ مطالعہ ہے اس میں عطیہ کے نام کے آخری خط پر ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء کی تاریخ ہے۔ خطوط کی تعداد پچپن ہے۔ اس چھوٹی تقطیع کے کتابچے میں کوئی خط دو صفحے سے زیادہ نہیں۔ شبلی ایسے طومار نویس مصنف سے یہ کیونکر توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے محبوبہ کو خط لکھے۔ اور اس قدر مختصر نویسی سے کام لے۔ کاروباری زبان استعمال کرے پھر حیرت اس امر پر ہے کہ یہ معاشقہ تین برس تک جاری رہے اور خطوط کی تعداد پچپن ہی رہے۔ دریا کو بہنا اور شبلی کو لکھنا کون سکھائے۔

اصل معاملہ یوں ہے کہ مولانا کی حد درجہ کی نفیس طبیعت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کسی قدر حُسن دوست ہوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ عطیہ اور زہرا حُسنِ سیرت کے علاوہ حُسنِ صورت کے زیور سے بھی مزین تھیں۔ اور چونکہ مولانا کو ان خواتین سے اُٹھنے بیٹھنے کے اکثر مواقع ملتے رہے۔ اس لئے انھیں ان سے ایک گونہ دل بستگی پیدا ہو گئی تھی مولانا اس رنگینیِ خیال کو صرف تازگیِ دل و دماغ کے لئے قایم رکھنا چاہتے تھے۔ ایک عورت کو خوش کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ آپ اشارۃً کنایۃً اس کے ظاہری حُسن کی مدح سرائی اور اپنی شیفتگی اور شیدائیت کا ورد کرتے رہیں۔ اور یہی وہ کارگر تیر ہے۔ جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ چنانچہ مولانا کے آزمائے ہوئے بازوؤں سے کوئی تیر ایسا نہیں نکلا۔ جو جا کر سیدھا نشانے پر پیوست نہ ہو گیا ہو۔

مولانا کے خطوط میں لجاجت بھی ہے۔ کہیں پھیکی پھیکی، اور کہیں ذرا تیز۔ اس سے مقصود صرف اتنا ہے کہ اس مصنوعی ربودگی کی شراب کو، جس کی بے کیفی کی پردہ دری کا انھیں ہر وقت خطرہ دامن گیر رہتا ہے۔ اس آنچ سے دو آتشہ اور سہ آتشہ بنا دیا جائے۔ سنیئے تو اقبال ایک ستنبیہ کی زبانی صنفِ نازک کو مردوں کے اس داؤ پیچ سے کس طرح آگاہ کرتا ہے:۔

اے زناں! اے مادراں! اے خواہراں!
زلیستن تا کے مثالِ دل براں،

دل بری اندر جہاں مظلومی است
دل بری محکومی و محرومی است

خود گدازی ہائے او مکر و فریب — در دو داغ و آرزو مکر و فریب
گرچہ آں کافر حرم سازد ترا — مبتلائے درد و غم سازد ترا
مارِ پیچاں از خم و پیچش گریز — زہر بالیش را بہ خونِ خود مریز

مولانا کے بعض شاگرد اس معاملہ میں بڑے ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ اور جب کبھی بھی مولانا کے اس فرضی معاشقہ کا ذکر آتا ہے، وہ توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ اول تو جب ہم نے عرض کیا۔ اس معاشقہ کی کوئی اصل ہی نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو اس میں مضایقہ کیا۔ اس سے تو مولانا کی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کے متعلق اور زیادہ حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے کہ ایسی جانکاہ روحانی مرض کے باوجود مولانا کا ایک قدم بھی راہ راست سے ہٹ کر نہیں پڑا۔ اور زندگی کا جو نصب العین قرار دیا تھا۔ اسے ایک پل کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

مولانا جب بھی ان خواتین کو خطوط لکھنے بیٹھتے ہوں گے۔ انھیں خلاف معمول اپنی تحریر میں تبدیلی کرنا پڑتی ہوگی اور ظاہر ہے کہ جب بھی کوئی آدمی اپنی عام روش سے علیحدہ ہو کر چلے۔ وہ اُکھڑ جاتا ہے اور اس کے قدم ڈگمگانے لگ جاتے ہیں۔ ان خطوط کے آئینہ میں یہ پس منظر ہر جگہ موجود ہے اور دل و دماغ کی یہ کشمکش بعض اوقات مولانا کو ایسی ذہنی اُلجھن میں ڈال دیتی ہے کہ وہ چند سطور پر ہی اکتفا کر کے خط بند کر دیتے ہیں۔

اس وقت تک جو کچھ عرض کیا گیا۔ وہ صرف بر سبیلِ تذکرہ تھا۔ اس مقالہ کا اصل موضوع مولانا کی فارسی شاعری پر صرف ان اشعار کی روشنی میں جو اس مجموعۂ خطوط میں ذکر ہوئے ہیں۔ مختصر سا تبصرہ کرنا ہے اور یہ تحریک مجھے مولانا نیاز کے مالہ و ماعلیہ کو پڑھ کر ہوئی۔ جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

جن اشعار پر اسوقت تنقید کرنے کا ارادہ ہے ان میں سے کچھ وہ ہیں جن سے خالد حسن صاحب قادری نے اپنے مضمون کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے بحث کی ہے اور کچھ وہ ہیں جنھیں خود مولانا نے ان خطوط میں ذکر کیا ہے۔ اس مجموعے میں ایک مرثیہ اور چار چھوٹے چھوٹے قطعے بھی ہیں۔ مرثیہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ گو وہ مولانا کے قلم سے ہی نکلا ہے۔ لیکن زہرا بیگم کی ماں کی وفات پر زہرا بیگم کی زبان سے وہ اشعار کہے گئے ہیں ——— مرثیہ گوئی کی دقتوں کے پیشِ نظر بچارے شبلی سے یہ توقع رکھنا کہاں تک درست ہوگا کہ وہ زہرا کی ماں کا مرثیہ لکھ کر معیاری چیز پیش کر سکے۔ کم و بیش یہی حال قطعات کا ہے۔ یا تو ان کے متعلق تقاضا کیا گیا ہے اور یا مولانا نے مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر خود بخود کچھ کہہ دیا۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں:۔

بمبئی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

(۱) نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را　　طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرو را

پہلے مصرعہ میں جس 'متاعِ کہنہ و نو' کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے میں اس کی تفصیل ہونا چاہیئے تھی۔ حالانکہ جن دو اشیا کا دوسرے مصرعہ میں ذکر ہے، وہ دونوں متاعِ کہنہ کی ذیل میں تو آسکتی ہیں۔ لیکن اُن میں سے کسی کو بھی 'متاعِ نو' نہیں کہا جاسکتا۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ 'طرازِ مسندِ جمشید' اور 'فرِ تاجِ خسرو'۔ مسندِ جمشید اور تاجِ خسرو سے مختلف ہیں۔ گویا شعر کا مفہوم یہ ہے۔ کہ 'طراز مسند' اور 'فر تاج' بمبئی پر فدا کردو نہ کہ خود مسندِ جمشید اور تاجِ خسرو[1]، ان دو نقائص کے علاوہ شعر میں ایک معنوی نقص اور بھی ہے۔ یعنی بمبئی کی دلچسپیوں پر جن اشیا کو مولانا نثار کرنا چاہتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے تصرف میں نہیں۔ مسند جمشید کی ہے، تو تاج خسرو کا۔ چاہیئے تو یوں تھا کہ مولانا کسی ایسی چیز کا ذکر کرتے جو ان کی اپنی شمار کی جاسکتی

(۲) دامنِ عیش زدستم نہ رود تا شبلی　　دامنِ بمبئی از کف نہ دہم تا باشم

اس شعر میں اور تو کوئی نقص نہیں۔ سوائے اس کے کہ دامن اور تا کی تکرار کانوں کو بری معلوم ہوتی ہے۔

(۳) شبلی خراب کردۂ چشمِ خراب اوست　　تو در گماں کہ مستیِ او از شراب بود

خراب کے حقیقی معنی تو تباہی اور بربادی کے ہیں۔ لیکن مخمور اور مدہوش کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ چشمِ خراب سے مراد چشمِ مخمور ہے اور شبلی خراب سے مراد شبلی مخمور یا بدمست لئے جاسکتے ہیں۔ لیکن خراب کردہ ان معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ خراب کردہ بہ معنی برباد شدہ تو درست ہے۔ لیکن مخمور یا بدمست کے معنوں میں غلط۔ مولانا اس مصرع کو اگر یوں کہتے تو بہتر ہوتا:۔ "شبلی خرابِ نرگسِ چشمِ خراب اوست" دوسرے مصرع میں 'بود'، نہایت بے موقعہ ہے۔ است ہونا چاہیئے تھا۔ بود کا مطلب یہ ہوگا کہ شبلی کبھی تو ضرور بدمست تھا۔ لیکن اب نہیں رہا جو سراسر غلط ہے۔

(۴) شبِ وصل است حیا گر بگزاری چہ شود　　یک دمم تنگ در آغوش فشاری چہ شود

مولانا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ چونکہ شبِ وصل ہے۔ اگر شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر مجھ سے بغل گیر ہو جاؤ تو کیا حرج ہے، یہ شعر مطلع غزل ہے۔ جس میں 'چہ شود' ردیف ہے۔ جو دونوں مصرعوں میں دہرائی گئی ہے لیکن جہاں تک شعر کے مفہوم کا تعلق ہے۔ ایک 'چہ شود' زاید ہے[2] اور مفہوم شعر اس کے بغیر ہی مکمل ہے۔ دوسرے مصرع میں بھی اسی طرح کا ایک نقص ہے۔ افشردن یا فشردن کے معنی نچوڑنے کے ہیں۔

---

[1] چونکہ طراز اور فر، مسند جمشید اور تاج خسرو کا لازمی جزو ہیں، اس لئے یہ اعتراض درست نہیں۔

[2] زاید نہیں ہے، دوسرا مصرعہ پورا کا پورا بدل واقع ہوا ہے پہلے کا۔ (اڈیٹر)

افشردۂ انگور، عرقِ انگور کو کہتے ہیں۔ مولانا نے فشردن بھینچنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ تنگ کی قید لگا دی ہے، اول تو در آغوش فشردن بھی محاورہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ اہلِ زبان در آغوش گرفتن کہتے ہیں۔ اس پر تنگ کا بڑھانا غلط در غلط ہے۔ کیونکہ تنگ کا مفہوم افشردن کے معنوں میں موجود ہے۔ اور یہ 'بے ضرورت' ہے۔

(۵) بے حاصلی نگر کہ بہ ایں دوری از رخش — صد جائے بہرِ بوسہ نشاں کردہ ایم ما

مولانا کا مقصد ہے کہ باوجود اس کے کہ ان میں اور محبوب میں اتنا بعد منزل ہے۔ پھر بھی انھوں نے محبوب کے چہرے پر سینکڑوں ایسی جگہیں انتخاب کر رکھی ہیں، جہاں وہ بوسہ دینے کے آرزو مند ہیں اور اپنی اس حرکت کو وہ بے حاصلی یعنی لغویت سے تعبیر کرتے ہیں۔

آپ محسوس کریں گے کہ اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے الفاظ اور تعبیر دونوں حد درجہ غیر جاذب ہیں۔ نیز معنوی نقص یہ ہے کہ محبوب کو چومنے سے جو چیز مانع ہو رہی ہے۔ وہ بعد مسافت نہیں[1]۔ کیونکہ یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اگر بعد مسافت نہ رہے تو شاعر ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا۔ ذوق کا ذیل کا شعر پڑھیے اور سوچئے کہ کون سی چیز اس کی راہ میں حایل ہے۔

پردہ درِ کعبہ کا اُٹھانا تو ہے آساں — پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا

(۶) از تو ناید گرہ بندِ قبا وا کردن — اگر ایں عقدہ بہ من باز سپاری چہ شود

گرہ بندِ قبا، اور 'باز سپاری' دونوں ترکیبیں محلِ نظر ہیں۔ گرہ بندِ قبا میں یا گرہ زائد ہے، اور یا بند۔ کیونکہ دونوں لفظ مترادف ہیں[2]۔ خسرو کا ایک شعر ہے:

بیاؤ بند قبا باز کن ولے بینش — کہ صبر ہم چو قبائے تو بر دلم تنگ است

'باز سپاری' میں 'باز' کا لفظ زاید ہے۔ کیونکہ مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم سے تو کرتے کے بٹن کھلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لئے اگر اس عقدہ کشائی کی مہم کو میرے ذمہ لگا دو تو کیا ہرج ہے۔ یہ مفہوم باز کے بغیر مکمل ہے اور اگر باز کا لفظ بڑھا دیا جائے تو اس میں تکرار کے معنی پیدا ہو جائیں گے۔ جسے درست سمجھنے کے لئے ہمارے پاس کوئی قرینہ نہیں۔

دوسرے مصرع کو یوں بدلا جا سکتا ہے:۔ — حلِ ایں عقدہ بہ من گر بہ سپاری چہ شود

(۷) ذوقِ نظر بہ لذتِ کاوش نمی رسد — داغم ازیں کہ دل نہ تواں کرد دیدہ را

مولانا نے خود ہی اس شعر کی تشریح کر دی ہے۔ اگرچہ پہلے مصرع کے الفاظ سے یہ مفہوم متبادر نہیں ہوتا۔ لیکن تاہم بہ فتوائے تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں، ایمان لائے بغیر چارہ نہیں، شعر اچھا ہے۔

[1] بعد مسافت کیوں نہیں؟ جبکہ یہی ایک سبب ہو سکتا ہے۔ [2] گرہ اور بند دونوں کا

اور اگر تھوڑی سی تبدیلی اور کر دی جائے تو شاید بہتر ہو جائے گا۔

لطفِ نظر بہ لذتِ کاوش نمی رسد　　واغم کہ آہ! دل نہ تواں کرد دیدہ را

اسی غزل کا دوسرا شعر ہے:۔

(۸) چشمش بہ سوئے ما نگہِ ناتمام کرد　　ساقی بہ جامِ ریخت مئے نارسیدہ را

'نگہِ ناتمام' سے مولانا کی مراد غالباً چشم 'نیم باز' ہے۔ اور یہ ترکیب 'مہ ناتمام' پر قیاس کر کے گھڑ لی گئی ہے۔ شعر میں معنوی حیثیت سے یہ نقص ہے کہ 'نگہِ ناتمام' میں جو کمی ہے۔ وہ بہ لحاظ کمیت کے ہے اور 'مئے نارسیدہ' میں بہ لحاظ کیفیت کے، اس لئے 'نگہ ناتمام' کو 'مئے نارسیدہ' سے تشبیہ دینا درست نہیں۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا نقص یہ ہے کہ جب مولانا نے آنکھوں کو جام سے تشبیہ دی اور 'نگہ ناتمام' کو 'مئے نارسیدہ' سے اور 'نگہِ ناتمام' سے مراد 'چشم نیم باز' ہے، تو وہ کمی جس کی مولانا شکایت کر رہے ہیں جام میں پائی جاتی ہے نہ کہ مے میں۔ یعنی شکایت اس بات کی نہیں ہونا چاہئے تھی کہ 'شراب نارسیدہ' ہے۔ بلکہ اس امر کی ہونا چاہئے تھی کہ 'جام شراب' لبالب نہیں بھرا گیا اور شاعر کی پیاس نہیں بجھ سکی۔

مزید براں محبوب کی خمار آلودہ نگاہوں کی کیفیت، آنکھیں خواہ پوری کھلی ہوں، یا نیم باز ہوں، ایک ہی رہے گی۔ اس لئے یہ کہنا کہ اس کی نیم باز آنکھوں میں خمار اور مستی پورے طور پر جلوہ گر نہیں تھی، غلط ہے۔

(۹) باما بہ ہر معاملہ بدگماں نہ بود،　　خوش بود آنکہ رازِ محبت عیاں نہ بود

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہمیں محبوب سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ہم سے ہر معاملہ میں بدگماں نہیں تھا۔ دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں۔ بہت اچھا ہوا کہ ہماری محبت کا اسے علم نہیں۔ ورنہ وہ ہر معاملہ میں ہم سے بدگماں ہو جاتا۔

جس قدر شعر کی زبان ناقص ہے، اسی قدر خیال ناقص ہے۔ ہر معاملہ میں بدگمان نہ ہونے کا یہ مطلب ہے۔ کہ بعض معاملات میں بدگمان ہے۔ اگر بدگمان ہے۔ تو کیوں، اس کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کے علاوہ محبت میں یہ خواہش کہ محبوب کو محبت کا علم نہ ہونے پائے۔ بالکل غیر فطری امر ہے۔ کیونکہ محتاط سے محتاط آدمی کی بھی خواہش یہ ہوا کرتی ہے۔ کہ محبوب کو تو اس کی محبت کا ضرور علم ہونا چاہئے۔ دوسروں کو ہو نہ ہو۔

'باما' بہ معنی ازما ہے اور دوسرے مصرع میں آں زاید ہے۔ 'خوش بود' کا ٹکڑا بہت ہی ناخوش معلوم ہو رہا ہے۔ اسی غزل کا دوسرا شعر ہے:۔

(۱۰) از لذتِ ادائے ستم مے تواں شناخت　　کیں جور از تو بودہ و از آسماں نہ بود

شعر کا مطلب یہ ہے کہ آسمان بھی تکلیفوں اور مصیبتوں کی مشق کر رہا ہے اور تم بھی۔ لیکن چونکہ

تمھاری جفا میں ایک خاص قسم کی لذت ہوتی ہے۔ اس لئے جب کبھی کسی ایسی مصیبت کا نزول ہوتا ہے، مجھے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس تکلیف کا سرچشمہ تم ہو نہ کہ آسمان۔

پہلے مصرع میں لذت ادائے ستم، سے خدا جانے مولانا کی مراد کیا ہے۔ اگر مراد طریقہ یا طرزِ ستم ہے۔ تو 'ادا' ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی اور مفہوم پیشِ نظر ہے تو الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:۔

صد حرفِ راز بود نہاں در نگاہِ من شادم کہ کار با صنمے نکتہ داں نہ بود

اس شعر کا مفہوم تقریباً وہی ہے۔ جو اس غزل کے مطلع کا ہے اور جس پر ہم ابھی ابھی اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ جو اعتراض اس شعر پر وارد ہوتا ہے وہ اس پر بھی وارد ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ 'صد حرفِ راز' اور 'صد راز' کا مفہوم اگر ایک ہی ہے۔ تو صرف 'صد راز' کہنا کافی تھا۔ 'نکتہ داں' کی ترکیب بھی محلِ نظر ہے۔ جو آدمی دوسروں کی نگاہوں سے حقیقت کو بھانپ لے۔ اسے نکتہ رس کہتے ہیں، 'نکتہ داں' نہیں کہتے۔ مزید براں چونکہ راز کے لفظ میں اخفا کا مفہوم موجود ہے۔ اس لئے 'نہاں' کا لفظ غیر ضروری ہے۔

یہ تھے وہ اشعار جن پر ہمیں اس مقالہ میں تنقید کرنا مقصود تھی۔ اسے سوءِ اتفاق ہی کہئے کہ اس مجموعہ میں جو اشعار نقل ہوئے ہیں وہ معیاری نہیں۔ لیکن اس سے یہ خیال نہ کیجئے گا کہ مولانا کی تمام فارسی شاعری کا یہی حال ہے۔ زیرِ تنقید اشعار سب کے سب 'دستۂ گل' یا 'بوئے گل' سے لئے گئے ہیں۔ یہ دونوں مجموعۂ ہائے اشعار مولانا کے دیوان فارسی کے آخر میں لگا دئے گئے ہیں اور تقریباً اس عہد کے کلام پر مشتمل ہیں۔ جو اس صدی کی ابتدا میں مولانا کے قلم سے نکلے۔ یہ وہ عہد ہے جب مولانا کی جوانی کے سب ولولے سرد ہو چکے تھے۔ اور یہی وہ عہد ہے۔ جب مولانا کے تعلقات فیضی خاندان کی خواتین سے قایم ہوئے۔

مولانا کا دیوان جو قصائد، مراثی، چند نامکمل مثنویوں اور ایک مختصر سے مجموعۂ اشعار پر مشتمل ہے۔ یک نہایت ہی نادر چیز ہے۔ قصائد میں جو زورِ بیان اور روانی پائی جاتی ہے۔ وہ اس عہد کے کسی اور شاعر کے کلام پر شاید ہی مل سکے۔ غزلیات کا مجموعہ جو یقیناً مولانا کا اپنا انتخاب ہے۔ بڑے بڑے قیمتی جواہر ریزے اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ جب اس انتخاب کا 'گلدستۂ گل اور بوئے گل' کی غزلیات سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ تو مشکل سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مجموعے ایک ہی شاعر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

۱؎ فارسی میں لفظ ادا، رمز و اشارہ کے معنے میں بھی مستعمل ہے۔ ۲؎ حرفِ راز کہنا زیادہ لطیف انداز بیان ہے۔ نکتہ داں اور نکتہ رس کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں، اہل زبان زیادہ تر نکتہ داں ہی لکھتے ہیں۔ (اڈیٹر)

نظم تعزیت

(پروفیسر محفوظ الحق مرحوم کی یاد میں)

پروفیسر محفوظ الحق، بنگال کے ان چند اہل علم میں سے تھے، جنکے نقوش فضل و کمال کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ پروفیسر موصوف نے آخری دم تک علم و ادب کی جیسی خاموش خدمت انجام دی ہے گو اس کا علم عوام کو نہ ہو لیکن خواص کو ہے اور اس لئے ان کا سانحۂ ارتحال واقعی "موت العالِم، موت العالَم" کا حکم رکھتا ہے۔

جناب جمیل مظہری نے یہ نظم انھیں کی یاد میں لکھی ہے جو بزم احباب کلکتہ کے جلسہ میں انھوں نے پڑھکر سنائی تھی۔ چونکہ پروفیسر محفوظ الحق سے میں بھی رابطۂ محبت رکھتا تھا اس لئے میں دل کی تمام تر اندوہگینیوں کے ساتھ اسے نگار میں شایع کرتا ہوں اور جناب جمیل مظہری کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھکو اس کی اشاعت کی اجازت دی۔

نظم کی خوبیوں کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کیونکہ جو چیز داد کی حد سے گزر جائے، اسکی داد خاموشی ہی سے دیجا سکتی ہے۔ — ولله درّه

نیاز

رہ عدم کا مبارک تمھیں سفر محفوظ،
اگرچہ راہ نئی ہے نئی زمیں اے دوست
کسی کا نالۂ بے تاب پیچھے پیچھے ہے
بھلا سکیں گے تمھیں ہم نہ عمر بھر محفوظ
تم اس سفر میں اکیلے مگر نہیں اے دوست
صدائے گریۂ احباب پیچھے پیچھے ہے

یہ راہ وہ ہے جہاں رہنما نہیں ملتا
مسافروں کو کوئی نقش پا نہیں ملتا
یہاں جرس کی فغاں ہے نہ پاؤں کی آواز
ملے گی بھی تو ملے گی تمھاری ہی آواز
نکل نکل کے جو تم سے خلا میں تھیں محفوظ
وہ جنبشیں جو سکوتِ فضا میں تھیں محفوظ
وہ قہقہے جو لگائے تھے بزم یاراں میں،
وہ زمزمے جو سنائے تھے بزم یاراں میں
تمھیں لباسِ اثیری[1] میں پا کے آئیں گے
حیات رفتہ کی ہر داستاں سنائیں گے
اب ان کی یاد سے ہونا نہ مضمحل اے دوست
وہ زندگی تھی اک افتادِ آب و گل اے دوست

بس اب حیاتِ حقیقی کے آرہے ہیں حواس،
نسیمِ لطف چلی آرہی ہے گلشن سے
بہ گوشِ شوق سُن اے طائرِ چمن پرواز
سفر یہاں سے بہ تائید جذب کامل ہے
یہ ہے فضائے اثیری یہاں سے آگے جاؤ
مقامِ فکر سے آگے مقامِ عرفاں ہے،
جو روح وحدتِ کبریٰ میں مل کے کھو جائے
بلندیوں کو محلِّ نظر بنائے ہوئے،
وہ پیچھے رہ گئی بزمِ جہاں کی آبادی
وہ لہلہاتی ہے طوبا کی شاخِ بارآور
وہ دیکھو باغ میں اہلِ جناں ٹہلتے ہیں
وہ دیکھو سعدی و خسرو ملا رہے ہیں ساز
زبانِ حال سے کہتے ہیں یوں کہ خوش وطنے ست
پہونچ چکا ہے وہاں بھی مگر تمھارا نام
حدیثِ شوق لئے تحفۂ سلام لئے
کسی کے ہاتھ سے بھی پاؤ احترام کرو
پکارتے ہیں رفیقانِ بادہ خوار تمھیں
جمے ہوئے ہیں جنیدی و بوذری دیکھو
ہے گوشے گوشے میں یارانِ ذی کمال کی بزم
کہیں ہے رومی و رازی میں بحثِ عشق و خرد
کہیں تسخرِ سودا ہے میرِ محزوں سے
جو گوئٹے کو برا دن سناتے ہیں اشعار
کہیں پہ اہلِ نظر ہیں کہیں پہ اہلِ دل
پرانے دوست بھی بچھڑے ہوئے اعزّہ بھی
ستم کشانِ دغا کا پیام کہہ دینا

اُتر رہا ہے فضائی کشافتوں کا لباس
یہ گردِ راہ ہیں ان کو جھٹک دو دامن سے
کہ آرہی ہے پرِ جبرئیل کی آواز
یہ راہ وہ ہے کہ منزل کے بعد منزل ہے
مقامِ شوق سے نکلو مقامِ فکر میں آؤ
اور اس کے بعد حجاب و خیالِ جاناں ہے
تو سلسلہ یہ منازل کا ختم ہو جائے
قدم بڑھائے ہوئے ہاں قدم بڑھائے ہوئے
نظر کے سامنے ہے اب جناں کی آبادی
وہ جھجھماتے ہیں فردوس کے طلائی در
وہ دیکھو عرفی و غالب وہاں ٹہلتے ہیں
گھنیری چھاؤں میں بیٹھے ہیں حافظِ شیراز
فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے ست
کہ منتظر ہے درِ خلد پر عمر خیام
کفِ عطا پہ مئے معرفت کا جام لئے
عطائے پیرِ مغاں ہے، جھکو سلام کرو
بلا رہا ہے تماشائے لالہ زار تمھیں
اِدھر ہے مجمعِ رندانِ کوثری دیکھو،
یہ اہلِ قال کی مجلس وہ اہلِ حال کی بزم
کہیں غزالی و طوسی میں منطقی رد و کد
اُلجھ رہا ہے ارسطو کہیں فلاطوں سے
تو طعنہ زن ہے کہیں ہر کلے پہ شوپنہار
قدم قدم پہ ملے گی تمھیں نئی محفل
اسی دیار میں ہوں گے بشیر مرزا بھی
ملیں کہیں تو ہمارا سلام کہہ دینا

اقبال منظری

Mental Plane of Astral Plane

شامِ اپالو

برگ و بارِ زندگی پر چھا گئیں رعنائیاں
ناز سے لیں نوعروسِ شام نے انگڑائیاں

شام کی سرمستیوں میں میکدے لٹنے لگے
ابر پاروں سے شہابی تیر سے چھٹنے لگے،

مشرقی زہرہ جبینوں کے پرے آنے لگے
بمبئی کے ساحلوں پر ناز فرمانے لگے

سیم تن ہیں، گلبدن ہیں، ریشمی ملبوس میں
جگمگاتے چاند ہیں بلّور کے فانوس میں

یا گلوں کی روح کے سائے ہیں مصروفِ خرام
کامیاب و کامران و شادمان و شاد کام

رنگ کے زرّیں فسانے شعر فرماتے ہوئے
ہر قدم پر داستانِ طور دُہراتے ہوئے

چاندنی کے زمزمے بھرتے ہوئے چلتے ہوئے
اہتمامِ رنگ میں آذر کدے ڈھلتے ہوئے

مسکراہٹ زیرِ لب تولے ہوئے ہر بات کو
جیسے تارے ٹوٹ کر بیوندِ دل ہوں رات کو

پھول سے شاداب چہروں پر متانت کا شباب
جیسے موجوں میں اُلجھ جائے شعاعِ آفتاب

سایۂ کاکل کی موجیں عارضِ گلفام پر
جس طرح لہرائے ناگن ایک زرّیں جام پر

روحِ گم گشتہ کو پھر آواز دینے دے مجھے
ہم نشیں! خاموش رہ اور سانس لینے دے مجھے

شمیم نعمانی

کلام اسعد شاہجہانپوری :-

دل ان کی بزم میں نظریں اُٹھا کے ڈوب گیا
ستارہ جیسے کوئی جھلملا کے ڈوب گیا

اُٹھا سکا نہ قیامت سرشکِ غم کوئی
اک آفتاب لبِ بام آ کے ڈوب گیا

اسی فضا میں جہاں روز صبح ہنستی ہے
شبابِ مثلِ شررِ مسکرا کے ڈوب گیا،

سکونِ دل نے کیا بزمِ یار میں یہ سلوک
سفینہ جیسے کنارے لگا کے ڈوب گیا

جو میں سنانے کو مضطرب تھا، وہی فسانہ سنا گئے تم
مری محبت بھری تمنا، مری نگاہوں سے پا گئے تم

کبھی ستاروں کی انجمن میں، کبھی ستاروں کے بانکپن میں
وہاں وہاں زندگی ہے رقصاں، جہاں جہاں مسکرا گئے تم

تمہاری آنکھوں کے تذکرے ہیں بمبئی ساحلِ کوثر
جہاں بڑی پارسائیاں تھیں، وہاں بھی مستی لٹا گئے تم

شیفتہ

(بیاض نیاز)

شیفتہ ضبط کرو ایسی بھی کیا بیتابی
جو کوئی ہو تمھیں احوال سنانا دل کا

نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین،
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

گہ ہم سے خفا وہ ہیں گہے ان سے خفا ہم
مدت سے اسی طرح نبھی جاتی ہے باہم

بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دل شورش ادا سے ہم

یا اپنے جوش عشوۂ پیہم کو تھامئے
یا کہئے میں بھی نالہ شورش فزا کروں،

طوفان نوح لانے سے اے اشک فایدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

جو دیکھنا ہو دیکھ لیں اخترشناس جلد
نالے اگر یہی ہیں تو پھر آسماں نہیں،

آرام سے ہو کون جہانِ خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

آخر جہان میں شب تاریک بھی تو ہے
اچھا نہ آئیں آپ شب مہتاب میں

ہوتا ہے اژدہام تمنا اسی قدر
ہوتی ہے جتنی دیر کشود نقاب میں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

ہائے وہ شیفتہ کی بیتابی
تھام لینا وہ تیرے محمل کو

اتنی نہ بڑھا پاکی دامن کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

اتنی بھی بُری ہے بے قراری
اب آپ سے اُنس کم کریں گے،

میری خاطر سے چلو شیفتہ واں
خیر، اُن سے تمھیں نفرت ہی سہی

نہ پوچھو شیفتہ کا حال صاحب
یہ حالت ہے کہ اپنے میں نہیں ہے

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

کیا جانے گزری غیر پہ کیا اس کی بزم میں
آئے وہ اس طرح کہ مجھے پیار آگیا

ایسی رغبت سے کرے قتل، گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ اس کو تو لو تم سے محبت نکلی

مطبوعات موصولہ

۴۵ء کی بہترین نظمیں

مرکز حلقۂ ارباب ذوق لاہور نے ۴۱ء سے ایک سلسلہ "بہترین نظموں" کے عنوان سے شایع کرنا شروع کیا ہے اور زیر نظر مجموعہ اسی سلسلہ کی پانچویں کڑی ہے جس میں ۴۵ء کی بہترین نظموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ "حلقۂ ارباب ذوق" کا معیار انتخاب کیا ہے، لیکن ہم نے اپنی جگہ یہ سمجھا ہے کہ جس نظم کا سمجھنا دنیا کے لئے سب سے زیادہ مشکل ہے وہی ان کے نزدیک سب سے بہتر ہے اور اگر اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو ہمارے نزدیک سب سے بہتر نظم سلام مچھلی شہری کی "آخری کش" اور اس کے بعد عادل کی نظم "دروازے" ہے باقی غالباً اتنی بہتر نہیں ہیں، کیونکہ وہ کسی نہ کسی حد تک سمجھ میں آجاتی ہیں۔

اس مجموعہ میں ۴۴ ترقی پسند شعراء کی نظمیں انتخاب کی گئی ہیں جن میں ن۔م۔راشد، اختر الایمان، ظفر یوسف، شاد عارفی اور میراجی بھی شامل ہیں۔ شعراء کے مختصر حالات بھی درج کئے گئے ہیں اور انکا لب و لہجہ بھی وہی ترقی پسندانہ ہے۔ کتابت و طباعت غنیمت ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ سنگم پبلشرز لمیٹڈ لاہور۔ قیمت درج نہیں ہے۔

سات کھیل

راجندر سنگھ بیدی کے سات ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ بیدی صاحب اسوقت ادب جدید یا ترقی پسند ادب کی دنیا میں کافی شہرت رکھتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کے افسانے اور ڈرامے تکنک پلاٹ اور انداز بیان ہر لحاظ سے بالکل اسی زمانہ کی چیزیں ہیں جبکہ دنیا پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہے اور انسان بھی اسی کے ساتھ بے اختیارانہ چیخنے چلانے پر مجبور ہو گیا ہے۔

بیدی صاحب اس میں شک نہیں بہت ذہین آدمی ہیں اور وہ بڑے اچھوتے زاویہائے نگاہ سے اپنے جذبات کو پیش کرتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ زبان اور محاوروں کی غلطیوں کی طرف ان کی نگاہ نہیں جاتی۔ اس مجموعہ میں ان کا ڈرامہ چانکیہ بڑا کامیاب ڈرامہ ہے، کیونکہ یہ انھوں نے ہندی بھاشا میں لکھا ہے اور اس میں زبان و خیال دونوں بہت ہم آہنگ ہیں۔ کتابت، طباعت، کاغذ سب بہت نفیس ہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ سنگم پبلشرز لمیٹڈ لاہور۔ قیمت درج نہیں ہے۔

سماج کا ارتقا

اس کتاب کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں انسان کے عہد وحشت کا ذکر ہے۔ دوسرے

میں جاگیر دارانہ نظام کی تاریخ دی گئی ہے۔ تیسرے میں سرمایہ داری سے بحث کی گئی ہے اور چوتھے میں اشتراکی نظام سے۔ موضوع کے لحاظ سے کتاب بہت کام کی ہے، لیکن زبان اور انداز بیان کو زیادہ سہل و شگفتہ ہونا چاہیئے تھا۔ بحالات موجودہ جبکہ مستقبل کا انسان بالکل نئے اصول پر تعمیر ہو رہا ہے اس کتاب کا مطالعہ افادہ سے خالی نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ سنگم پبلشرز لمیٹڈ لاہور۔ قیمت درج نہیں ہے۔

پل پر ترجمہ ہے ولڈر کی کتاب کا جسے شیر محمد اختر نے کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک پادری کی اس کوشش کا حال درج ہے جو اس نے ایک خاص حادثہ کا الٰہیاتی سبب متعین کرنے کے لئے اختیار کی تھی۔ یہ کتاب اس میں شک نہیں کہ مغربی ذہنیت کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہے، لیکن مشرقی ذوق کو دیکھتے ہوئے اس کے ترجمہ کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ترجمہ اچھا نہیں کیا گیا اور اس میں بہت سے جھول زبان اور انداز بیان کے پائے جاتے ہیں۔ ملنے کا پتہ: سنگم پبلشرز لمیٹڈ لاہور۔ قیمت درج نہیں ہے۔

سازِ نو رضوی خیر آبادی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ جناب صفی لکھنوی نے اپنے پیش لفظ میں ان کی شاعری کو اخلاق آموز ظاہر کیا ہے اور ان کو ایک خوش فکر، سلیم المذاق شاعر بتایا ہے۔ ہم بھی اس مجموعہ کو جستہ جستہ دیکھنے کے بعد اس نتیجہ تک پہونچے ہیں۔ قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ مکتبۂ رضوی۔ دہلی۔

برطانی مشن کا تاریخی فیصلہ اور قائداعظم کا تبصرہ

اس کتاب میں جناب عبدالوہاب غازی اصلاحی اعظمی نے برطانوی مشن کے فیصلہ اور اس کے ردعمل پر تمام وہ ضروری لٹریچر یکجا کر دیا ہے جو مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہر چند برطانوی مشن کا فیصلہ اور اس کے متعلق تمام وہ خط و کتابت جو لیگ، کانگرس اور مشن کے درمیان ہوئی ہے، اخباروں میں آچکی ہے، لیکن ضرورت تھی کہ ان کو کتابی صورت میں بھی پیش کیا جائے اور غازی صاحب نے یہ کتاب مرتب کر کے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ اُردو اشاعت گھر ۴۴ فیرلین کلکتہ

لاجونتی مجموعہ ہے ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کی نظموں کا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سائنس داں ہونے کی حیثیت سے تو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، لیکن اس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہے کہ وہ اُردو کے شاعر بھی ہیں اور ایسے شاعر کہ اگر وہ سائنس داں نہ ہوتے تو بھی ان کی شاعری ان کو شہرت دوام بخش سکتی تھی۔

حیرت ہے کہ وہ شخص جس نے اپنی تمام عمر علم الکیمیا کی خشک تحقیقات میں بسر کر دی اور جس نے ادب کو کبھی فن کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا، کیونکر اتنے اچھے، اس قدر صحیح اور ایسے دلدوز اشعار لکھ سکتا ہے۔ سب سے پہلی نظم اس مجموعہ میں خدا کے عنوان سے نظر آتی ہے اور جس وقت میں نے اس کو پڑھا تو حیران رہ گیا

لیکن جب سرسپرو کے مقدمہ پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب منشی ہرگوپال تفتہ کے نواسے ہیں جو غالب کے بڑے مخلص دوست تھے، تو حیرانی جاتی رہی۔ پہلا بند ملاحظہ ہو:۔

وہ ذات واحد وہ حسن یکتا کہ شمع پروانہ یقیں ہے — جو ذرہ ذرہ سے جلوہ افشاں تو ریشہ ریشہ میں جاگزیں ہے
نقاب شام خزاں اُلٹ دے تو داغِ لالہ سرشکِ شبنم — حجاب صبح بہار اٹھاوے تو بوئے گل روح انگبیں ہے
کہیں دل افروز لالہ و گل کہیں جگر سوز دیدہ و دل — کہیں نسیم بہار ہستی کہیں دم مرگ آفریں ہے

غرض میسر جو چشم دل ہو تو اس کا جلوہ کہاں نہیں ہے

کیا کوئی شخص اس کو پڑھکر یقین کر سکتا ہے کہ یہ کسی ہندو سائنس داں کی نظم ہے۔

اس مجموعہ میں ۵۰ نظمیں ہیں اور سب اپنے اپنے رنگ میں قابل داد ہیں، لیکن ان کی وہ نظم جو انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات کی جدائی پر لکھی ہے، بے پناہ ہے۔ اس کا عنوان ہے آجاؤ۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

میں جاگتا ہوں کہ شاید کہیں سے آجاؤ — یہیں پہ کھوئی گئی تھیں یہیں سے آجاؤ
نگاہیں ڈھونڈھتی پھرتی ہیں گوشہ گوشہ میں — نہیں زمیں پہ، تو عرش بریں سے آجاؤ
سپرد خاک اگر ہوگئیں تو کیا پروا — بشکلِ لالہ و گل ہی زمیں سے آجاؤ
چھپو گی پردۂ رنج و الم میں یوں کب تک — نکل کے تم دلِ اندوہگیں سے آجاؤ
ستم ہے مجھ کو پتہ تک نہیں گئی ہو کہاں — غرض جہاں بھی ہو للہ وہیں سے آجاؤ

ڈاکٹر صاحب پنجاب یونیورسٹی میں سائنس کے پروفیسر تھے اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد بھی علمی انہماک کا وہی عالم ہے، لیکن حیرت ہے کہ باوجود غیر معمولی مصروفیتوں کے وہ خدمت ادب کے سلسلہ میں ایسے تابناک جواہر پیش کرنیکے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ کتاب نہایت دبیز کاغذ پر مجلد شایع کی گئی ہے اور آنند سروپ بھٹناگر ۵/۱۵ تغلق روڈ نئی دہلی سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

قرآن اور سیرت سازی

ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ کے چند مقالات و خطبات کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل ملک کے سامنے آچکے ہیں۔ ان مقالوں میں عبادت، تصحیح فکر اور "کامیاب زندگی کا قرآنی تصور" بہت کامیاب و مفید معلومات و ہدایات کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ان مقالوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قرآنی تعلیمات کے ساتھ صدر درجہ شغف حاصل ہے اور انھوں نے انکا مطالعہ بہت دقت نظر سے کیا ہے۔ سب سے بڑی بات جو ان کے افادہ کو زیادہ پائدار بنا دینے والی ہے وہ لب و لہجہ کا درد و تاثر ہے، گو زبان اور انداز بیان اتنا سادہ و سلیس نہیں جتنا

ہونا چاہئے ۔ قیمت ہے۔ ملنے کا پتہ :- ادارۂ اشاعت اسلامیات حیدرآباد دکن

اسلامی تقاریب مجموعہ ہے مختلف اکابر اہل قلم کے مضامین کا جو مسلمانوں کے مذہبی تقریبوں کی معنویت ظاہر کرنے لئے لکھے گئے ہیں ۔ ان مقالات کی بنیاد مذہبی تاثرات پر قایم ہے، اسی لئے ان میں فلسفیانہ موشگافیوں سے کام نہیں لیا گیا اور انھیں لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے جو ریب و شک کے حدود سے گزر کر "ایقان" کی منزل تک پہونچ گئے ہیں ۔

اس مجموعہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مولانا مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، کے مقالات بھی شامل ہیں ۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ ادارۂ اشاعت اسلامیات حیدرآباد دکن ۔

رہنمائے قرآن سر نظامت جنگ بہادر کے ایک انگریزی مقالہ کا ترجمہ ہے جسے ڈاکٹر میر ولی الدین نے کیا ہے ۔ اس رسالہ میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیمات دینی و دنیوی حیثیت سے کسقدر بلند اور قرین عقل ہیں ۔ ترجمہ کافی شگفتہ ہے ۔ قیمت عہ ۔ ملنے کا پتہ :- ادارۂ اشاعت اسلامیات حیدرآباد دکن

تعلیم قرآن ترجمہ و تفسیر ہے بعض ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کی جو عام طور پر نماز میں پڑھی جاتی ہیں اس رسالہ کا مقصود یہ ہے کہ عام مسلمان نماز پڑھتے وقت جب ان صورتوں کو پڑھیں تو ان کا مفہوم بھی سامنے رکھیں ۔ قیمت ۱۲ ۔ ملنے کا پتہ :- ادارۂ اشاعت اسلامیات حیدرآباد دکن ۔

سفینہ پانچواں دیوان ہے جناب شفیق جونپوری کا جس میں نصف سے زیادہ حصہ غزلوں کا ہے اور اور اس سے کم نظموں کا ـــــ اس سے قبل جناب شفیق کے دو اوین پر کئی بار اظہار خیال کیا جا چکا ہے اور اگر آیندہ بھی انھوں نے ہر سال نیا مجموعہ کلام شایع کرتے رہنے کی رسم جاری رکھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خدمت کب تک انجام دینا ہے ۔

شفیق صاحب کی خصوصیت صرف یہ نہیں ہے کہ وہ بہت پُرگو شاعر ہیں بلکہ خوشگو بھی ہیں ۔ غزل ہو یا نظم وہ جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور سوقیت و ابتذال سے بہت پرہیز کرتے ہیں شفیق صاحب یدنشو پرانے اسکول کے شاعر ہیں، لیکن جدید تحریکات پر بھی وہ اظہار خیال کرتے رہتے ہیں اور بہت سنجیدہ طریقہ سے ـــــ غزلوں میں ان کا اسلوب عاشقانہ ہے اور جذبات کے لحاظ سے کافی بلند، نظموں میں وہ ہمیشہ مذہب و اخلاق کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں اور فنی حیثیت سے ردیف و قافیہ کے پابند ہیں ۔

ابتدا میں انھوں نے اپنے رجحان اور ذوق سخن پر خود بھی روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی ساتھ موجودہ نقادان فن پر بھی اظہار خیال کیا ہے، جو بڑی حد تک صحیح ہے ۔ شروع میں ایک فارسی غزل بھی ہے جو نہ ہوتی، تو اچھا تھا ۔ قیمت دو روپیہ ۔ ملنے کا پتہ :- سکریٹری نظام ادب جونپور ۔

اقبال اسکی شاعری اور پیغام

تصنیف ہے جناب شیخ اکبر علی ایڈوکیٹ لاہور کی جس میں فاضل مصنف نے اقبال کی شاعری اور ان کے پیغام کی تمام خصوصیات کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اقبال پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اس کو اگر کلام اقبال کی تفسیر کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس کے مصنف نے چونکہ اقبال کی زندگی کا مطالعہ بہت سے قریب سے کیا تھا، اسلئے انھوں نے اقبال کی شاعری کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے، جو اس وقت تک زیادہ واضح نہ تھے۔ قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: کمال پبلشرز۔ ۲۶۔ مال روڈ۔ لاہور۔

آبلے

مجموعہ ہے جناب احمد ندیم قاسمی کے تین طویل افسانوں کا جسے ادارۂ فروغ اُردو لاہور نے شایع کیا ہے۔

ان افسانوں کے مصنف شعر و ادب کی دنیا کے لئے کوئی نیا اکتشاف نہیں ہیں، اس سے پہلے بھی انکے افسانے شایع ہو کر درجۂ قبول حاصل کر چکے ہیں اور افسانہ نگاری کے اس نئے دور میں انھیں نظر امتیاز سے دیکھا گیا ہے، لیکن یہ افسانے اپنی روح کے لحاظ سے غالباً اور زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ افسانے انھوں نے گاؤں کے پس منظر کو سامنے رکھ کر لکھے ہیں اور جذبات کے جوش و خلوص اور لب و لہجہ کی صداقت کے لحاظ سے بہت موثر و دلکش ہیں۔ قیمت ۱۲ عہ

حدیث دیگراں

مجموعہ ہے خمار بارہ بنکوی کی غزلوں کا۔ خمار اس دور کے اُن نوجوان شاعروں میں سے ہیں جو اب بھی غزل کے شیدا ہیں اور شاعری کی اسی ٹکنک کے پابند ہیں جسے ترقی پسند شعراء نے پس پشت ڈال دیا ہے، اس لئے ہمیں خمار صاحب کی شاعری کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اور ان کا کلام پڑھنے سے وحشت نہیں ہوتی۔

ان کے کلام میں سوز و گداز کا عنصر کافی ہے جو تغزل کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ یقین ہے کہ مشق کے بعد طرز بیان اور اسلوب فکر میں بلندی بھی پیدا ہو جائے گی۔ طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: کتب خانہ تاج آفس۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی

سلطانہ رضیہ

فلمی ڈرامہ ہے جناب خورشید لکھنوی کا لکھا ہوا جسکا "پیش لفظ" پروفیسر احتشام حسین رضوی نے لکھا ہے اور کافی تعریفی الفاظ کے ساتھ، حالانکہ یہ ڈرامہ زبان، پلاٹ، ٹکنک، تاریخی حیثیت اور فلمی خصوصیات الغرض ہر لحاظ سے صد درجہ ناقص ہے اور اس قابل بھی نہیں کہ اسے یونہی پڑھا جائے چہ جائیکہ اس کا فلم طیار ہو۔ ہمیں حیرت اسکے مصنف پر نہیں بلکہ احتشام صاحب پر ہے جنھوں نے اسکو اسقدر سراہا ہے۔ کتابستان الہ آباد سے ملسکتا ہے

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہ سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱ - چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ - مادئین کا مذہب

۳ - حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و ننگ نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً۔ مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے

قیمت حصۂ اول للعہ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی - اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔
مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں
اور کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(تظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
نظیر کا مسلک
شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اسوقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء

اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

ترخانۂ جرأت اشتہار

ایک سال چھ ماہ تین ماہ ایک ماہ

ایک صفحہ ۶۰ روپیہ ۳۰ روپیہ ۱۵ روپیہ ۵ روپیہ

آدھ صفحہ ۳۶ روپیہ ۱۸ روپیہ ۹ روپیہ ۳ روپیہ

چوتھائی صفحہ ۲۰ روپیہ ۱۰ روپیہ ۵ روپیہ ۲ روپیہ

جنوری سنہ ۴۴ء

(جدید شاعری نمبر)

اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعری کی کیا حقیقت ہے اور آزاد و نظم نگاری کا وزن و قافیہ سے بے نیاز ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء

(قرآن نمبر)

اس میں ڈاکٹر ٹسڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ
ششماہی جاری نہیں ہو سکتا
سالانہ بیرون ہند دس روپیہ

(نوٹ) رسالہ ۱۵ راہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل و شوار ہے

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے مفت